چند اہم

قرآنی اِصطلاحات

صلاح الدین ایوبی

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاِنَّہٗ لَتَنۡزِیۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ؀

نَزَلَ بِہِ الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ ؀

عَلٰی قَلۡبِکَ لِتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِیۡنَ ؀

بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیۡنٍ ؀

اور بے شک یہ کتاب عالمین (جنّ وانس) کے پروردگار (اللہ) کی جانب سے نازل ہوئی ہے۔ اس (کتاب) کو لے کر روح الامین (جبرائیل علیہ السلام) اترے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر تاکہ آپ (اس کے ذریعے انسانوں اور جنّوں کو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے انجام سے) ڈرانے والوں (انبیاء علیہم السلام) میں سے ہو جائیں۔ (منصبِ نبوت پر فائز ہو جائیں۔۔۔ یہ کتاب) صاف واضح عربی زبان میں نازل ہوئی ہے۔ (بغیر فلسفہ وکلام اور کشف والہام والی)۔ [سورۃ الشعراء، 26:192-195]

Marfat.com

چند اہم قرآنی اصطلاحات

صلاح الدین ایوبی

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

Marfat.com

297.1226 Ayubi, Salah uddin
Chand Aham Qurani Istalahaat/ Salah uddin Auubi.- Lahore: Al-Faisal Nashran, 2018.
191p.
1. Quran - Istalahaat I. Title.
ISBN 978-969-503-1102-2

297.1226
۱۴۲۳۵۲

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

جولائی 2018ء
محمد فیصل نے
میاں سنز پریس سے چھپوا کر شائع کی۔
قیمت:-/350روپے
AI-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore. Pakistan
Phone: 042-37230777 & 042-37231387
http: www.alfaisalpublishers.com
e.mail: alfaisalpublisher@yahoo.com

Marfat.com

انتساب

علامہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ

کے تیرِ نیم کش

"قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں"

کے پسِ پردہ ان کے

خلوصِ نیت کے نام

Marfat.com

PANJAB
UNIVERSITY
LIBRARY

Marfat.com

فہرست

❁ اللہ کی بات	9
1- شاہد، شہادت اور حدود	11
2- توضیحات بسلسلہ شہادت	35
3- شہادتِ نفس	43
4- شفاعت کا قرآنی مفہوم	63
5- تقدیر کا مسئلہ	83
6- نبوت و رسالت بسلسلہ قانونِ اِتمامِ حجت	99
7- روح کا قرآنی تصور	123
8- نفس کی حقیقت	139
9- برزخ اور اوہامِ باطل	153
10- ربا اور اسلامی معیشت	181

❁❁❁

Marfat.com

Marfat.com

اللہ کی بات

قرآنِ حکیم عربی مبین میں نازل ہوا۔ جس قوم پر نازل ہوا عربی اُن کی اپنی زبان تھی، ان کے لیے قطعاً اجنبی نہ تھی۔ زمانۂ جاہلیت میں بڑے بڑے شعرا کا کلام جو ادبِ عالیہ کا نادر نمونہ تھا، بہت مقبول تھا۔ میلوں ٹھیلوں اور حج کے موقع پر پڑھا جاتا اور اہلِ عرب اس سے محظوظ ہوتے۔ اسی عالم میں جب قرآن نازل ہوا تو اللہ تعالیٰ کی بات کو بھی عربوں نے پوری طرح جانا اور سمجھا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد جب غیر عرب افراد نے اسلام قبول کیا، بالخصوص اہلِ ایران نے تو انھیں قرآن کے مطالب سمجھنے میں دشواری پیش آئی۔ افریقی ممالک نے اپنی زبان ترک کر کے عربی کو پوری طرح اپنا لیا مگر ایرانی اپنے زبان و ادب پر نازاں تھے اور اُن کے پاس اپنا فلسفہ وفکر بھی مزدکیّت کی شکل میں موجود تھا، اس لیے اہلِ ایران نے فارسی زبان کو ترک نہ کیا اور قرآن کی تفہیم کے لیے اُن کے علما نے قرآن کی تفاسیر لکھنا شروع کر دیں۔

اِسی طرح قرآن کی زبان پر پہلا حملہ اہلِ ایران کی جانب سے ہوا اور ان کے اہلِ علم نے جو تفاسیر لکھیں اُن میں قرآنی اصطلاحات کے کئی کئی معانی ایجاد کر لیے گئے حتیٰ کہ عجمی مفسرین دو مختلف المعانی الفاظ کو ایک دوسرے کے مترادفات قرار دینے سے بھی باز نہ آئے۔ دوسرا حملہ قرآن کی زبان اور اس کی اصطلاحات کی تفہیم پر نام نہاد مسلم فلاسفہ کی جانب سے ہوا جب اُنھوں نے نوفلاطونیت کے فلسفیانہ افکار کو دینی عقائد کا جز بنانے کی کوشش کی اور تیسرا حملہ وید اور اپنشد کے تراجم کے بعد اہلِ علم کے ہاتھوں اسلامی افکار میں ویدانت کی ترویج کی صورت میں وارد ہوا۔

مزدکیت، ویدانت اور نوفلاطونیت نے قرآنِ حکیم کی سادہ اور عام فہم اصطلاحات میں اپنے عقائد و افکار شامل کر دیے۔ اس کے نتیجے میں اللہ کی بات پردۂ خفا میں چلی گئی اور ان

Marfat.com

تینوں نظام ہائے فکر کی کوکھ سے تصوف نے جنم لیا جو اسلام کے پورے نظامِ فکر پر غالب آگیا۔ قرآنی اصطلاحات کو فلسفے یعنی نوفلاطونیت، مَزدکیت اور ویدانت کے معنی پہنا دیے گئے۔

زیرِ نظر کتاب...... چند اہم قرآنی اصطلاحات میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ عربی زبان و ادب اور قرآن ہی کی زبان کے آئینے میں اللہ کی بات کو، اہم قرآنی اصطلاحات کو دین کے مزاج کے مطابق سمجھا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو ''اِلٰہ'' کہا ہے یعنی مختارِ کُل اور اس کی تفصیل میں اپنے اسمائے حُسنیٰ سے لے کر اپنی آیاتِ انفس و آفاق تک کے تذکرے فرمائے ہیں مگر مفسرین نے اس کے معنی ''معبود'' کر دیے اور پھر ایسی ایسی توجیہات کی گئیں جو عالمی تصوف کے معیارِ باطل پر پوری اُترتی تھیں۔ یہی معاملہ ''نفس'' اور ''روح'' کا ہے۔ ''عالم'' اور ''شہادت'' کے معانی بھی بدل دیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں دیگر کئی اصطلاحات بھی زیرِ بحث آئی ہیں۔

اہلِ علم کی خدمت میں گزارش ہے کہ ازراہِ کرم ان معروضات کو نوفلاطونی، ویدانتی اور مَزدکی فلسفہ و فکر سے برأت کا اظہار کرتے ہوئے پڑھنے اور ان پر غور کرنے کی کوشش کریں۔ یہ کام ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہے اس لیے اصلاح کی گنجائش موجود ہے۔

خیر اندیش

صلاح الدّین ایوبی

Marfat.com

شاہد، شہادت اور حدود

ریاست مدینہ کو قائم ہوئے چار برس گزر چکے ہیں۔ ابھی پچھلے سال غزوۂ احد میں مشرکینِ مکّہ کے ساتھ ایک بڑا معرکہ پیش آ چکا ہے۔ مؤمنین نے عارضی طور پر نقصان اٹھایا لیکن پھر اپنے نبی ﷺ کی حفاظت میں اس طرح سینہ سپر ہو گئے اور مجتمع ہو کر قتال کے لیے دوبارہ تیار ہو گئے کہ مشرکینِ مکّہ اپنی متوقع ہزیمت کے خوف سے فی الفور پسپائی اختیار کر گئے۔ مؤمنین کی فتوحات کا یہ سلسلہ مختلف غزوات اور سرایا سے ہوتا ہوا غزوۂ بنی مصطلق (مریسیع) تک جا پہنچا۔ یہ صورتِ حال مدینہ کے یہود اور منافقین کے لیے نا قابلِ برداشت ہوتی جارہی ہے چنانچہ عبداللہ بن ابیّ نے اپنے بغض کا اظہار جن الفاظ میں کیا، انھیں قرآنِ حکیم نے اس طرح محفوظ کر دیا ہے:

يَقُولُونَ لَئِن رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ (8:63)

"یہ کہتے ہیں کہ ہم مدینہ واپس پہنچ جائیں تو جو عزت والا ہے وہ (نعوذ باللہ) ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔"

منافقین نے اسی پر بس نہ کی۔ مدینہ واپس پہنچتے ہی افواہ سازی کا بازار گرم کر دیا اور مومن عورتوں پر اتہام کا ایک سیلاب بلاخیز مدینہ کی گلیوں میں رواں دواں ہو گیا۔

واضح رہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا نام لے کر ایک عفیفہ کی جانب اس تہمت سازی کا سارا رخ مرکوز کر دینا ایک ظالمانہ اور منافقانہ کام ہے جو سو سال بعد محض ابنِ شہاب زہری کی اختراع ہے، جو محبتِ آلِ علی رضی اللہ عنہ رکھتا تھا لیکن اپنی چرب زبانی کی بدولت مروان کے دربار میں بیشمار مراعات اور رتبے حاصل کر کے عیش کی زندگی گزارتا رہا۔ دیگر درجنوں دلائل یک طرف زہری کا جھوٹ ثابت کرنے کے لیے صرف یہی ایک بات کافی ہے کہ وہ صفوان کی زبان سے

Marfat.com

یہ کلمات درج ہیں کہ ''میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا کو پہچان لیا کیونکہ آیات حجاب نازل ہونے سے پہلے میں نے انھیں دیکھ رکھا تھا۔ حالانکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر پیر کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ تک سب اس بات پر متفق ہیں کہ غزوۂ بنی مصطلق، غزوۂ الاحزاب سے پہلے ہوا اور آیاتِ حجاب سورۂ الاحزاب کا حصہ ہیں۔ قرآن پاک میں اس واقعے کا ذکر اس طرح ہوا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (23:24)

''جو لوگ پاک دامن عورتوں، بے خبر عورتوں، مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی ہے اور ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔''

اس آیت میں جمع کا صیغہ (بہت سی مومن عورتوں کا تذکرہ) اس سازش کی وسعت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی زہری کی روایت بہت سے تضادات کا شکار اور جھوٹ کا پلندہ ہے۔ جس شخص کو اپنی بیوی پر رتی بھر اعتماد نہ ہو (اور زہری نے گویا اس کا مکمل ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ فنعوذ باللہ من ذالک) وہی یہ کر سکتا ہے کہ بغیر کچھ بتائے، بغیر پوچھے اپنی بیوی سے ہفتوں تک کے لیے قطعِ تعلق کر لے اور کیسی بیٹی ہے جو ماں سے بھی نہیں پوچھتی کہ میرے ساتھ ایسا معاملہ کیوں پیش آ رہا ہے!

اس موقعے پر اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو تاکید کی کہ وہ کسی بھی طرح اس افواہ سازی کا حصہ نہ بنیں۔ اب جب کہ خود اللہ تعالیٰ نے مومنات کے کردار کی گواہی دے دی ہے اور انھیں ہر تہمت سے بری کر دیا ہے تو مؤمنین ضبط سے کام لیں:

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (17:24)

''اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ ایسی باتوں کو کسی بھی طرح زبان پر نہ لانا، اگر تم مومن ہو۔'' (زہری نے اس حکم کی مخالفت کرتے ہوئے داستانیں گھڑ لیں)

پھر اس کے بعد ایک ایسی بات ایک ذمہ داری کے طور پر کہہ دی جو مومن اور کافر معاشرے میں تمیز ظاہر کرتی ہے اور منافقین کے کردار سے بھی پردہ اٹھاتی ہے۔

Marfat.com

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (19:24)

''وہ لوگ جو یہ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے درمیان فحاشی پھیلے، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ اللہ ہی اس بات کو جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

یعنی اتہام سازی ہو (یا فی الاصل عملی طور پر فحاشی) ایک مومن معاشرے میں اس کے تمام موجبات اور محرکات کو ختم کرنا چاہیے۔ عیاں ہے کہ پوری تحقیق و تفتیش کے بعد ان برائیوں کو مٹا دینے کی کوشش مؤمنین کا فرض بنتا ہے، اس تقاضے کی بنیاد پر کہ مؤمنین نے اپنے آپ کو اور اپنے معاشرے کو عذاب دنیا اور آخرت سے محفوظ رکھنا ہے نہ یہ کہ فحش کو معاشرے میں پھیلنے دیں۔

مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی تاریخ سے آگاہ اہلِ علم یہ بخوبی جانتے ہیں کہ اگلے ہی سال پورے عالم عرب کے مشرکین الاحزاب کی صورت مدینہ پر چڑھ دوڑے۔ ادھر یہود کی خفیہ سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں اور منافقین نے بھی زبانی اور عملی طور پر مؤمنین اور بالخصوص نبی اکرم ﷺ کی ایذا رسانی کا کام زوروں سے شروع کر رکھا تھا۔ نبی ﷺ کے گھر پر منافقین کا گویا پہرا لگا ہوا تھا۔ بغیر اجازت لیے گھر میں گھس آتے، کام ختم ہونے پر، کھانا کھا لینے پر بھی اٹھنے کا نام نہ لیتے۔ نہ نبی ﷺ کے آرام کا کچھ خیال، نہ اُمہات المؤمنین کی موجودگی کا کوئی لحاظ۔ ایک جانب سکڑی سمٹی خاتون بے تحاشا اذیت سے گزر رہی ہے، منافقین ہیں کہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ سامنے بیٹھے ہیں۔ یہ صورتِ حال اس قدر تکلیف دہ تھی کہ سورۂ الاحزاب میں منافقین کے اس گھناؤنے کردار کو ہدفِ تنقید بنایا گیا اور بار بار یہ بات دہرائی گئی کہ تمھاری یہ سب حرکتیں نبی ﷺ کے لیے ایذا کا موجب بن رہی ہیں۔ غزوۂ اُحد کے بعد سے ان ریشہ دوانیوں نے جس قدر سر اٹھایا تھا، اب ان کی سرکوبی کا وقت آ گیا ہے۔

مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا (61:33)

''(یہ ایذائیں دینے والے منافقین) ان پر ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہوگی اور جہاں کہیں پائے جائیں، پکڑے جائیں اور بری طرح قتل کیے جائیں۔''

فحاشی، فحش کاری اور فحش الزامات کی بوچھاڑ منافقین کا مخصوص طرزِ عمل ہے جس کے

Marfat.com

ذریعے وہ کسی بھی معاشرے کو پستی میں دھکیل دیتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد پر لعنت بھیجی ہے جو فحاشی کے پھیلنے میں ممد و معاون بنتے ہیں اور انھیں عذابِ دنیا اور عذابِ آخرت کی وعید سنائی ہے۔ مؤمنین کو یہ ہدایت کی جارہی ہے کہ ان فاحش افراد کا تعاقب کریں اور انھیں عبرتناک سزائیں دیں۔

ایک طرف قرآنِ حکیم کا یہ بیان ہے جو کسی مزید وضاحت کا طالب نہیں۔ دوسری جانب ہمیں روایات سے ایسی اطلاعات ملتی ہیں کہ زنا کے مرتکب افراد کے بارے میں بہت ہی رازدارانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص کسی کے بارے میں ایسی اطلاع دے تو سنی ان سنی کر دیں۔ اگر کوئی زانی خود کسی کے سامنے اعترافِ جرم کرے تو چاہیے کہ اسے جھاڑ دیا جائے۔ اگر مجرم حاکم یا قاضی کے سامنے پیش ہو تو مجرم کی حوصلہ شکنی کی جائے اور معاملے کو سننے سے احتراز کیا جائے۔ حاکم کے سامنے کوئی زنا کا مجرم یا مجرمہ آ ہی جائے تو حاکم کو چاہیے کہ اس سے جان چھڑانے کی کوشش کی جائے۔ اگر فاعل یا مفعول میں سے کوئی پکڑا جائے یا از خود پیش ہو جائے تو اس امر کی کوئی ضرورت نہیں کہ فریقِ ثانی کا بھی کھوج لگایا جائے۔ ایک ہی فریق کو زانی ہو یا زانیہ سزا دے کر خاموشی اختیار کر لی جائے۔ خواہ فاعل ظالم و جابر ہی کیوں نہ ہو اس سے (اگر از خود نہیں آ گیا تو) کوئی تعرض نہ کیا جائے اور زانیہ اگرچہ درپردہ تعاون کرنے والی کوئی آبرو باختہ عورت ہی کیوں نہ ہو، اس کے چکّر میں پڑنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔

❁❁❁❁

روایات وضع کرنے والوں یا احادیثِ صحیحہ میں اِدخال کرنے والوں کے یہ کمالات ہی کافی نہیں تھے، ایک اور طبقہ بھی وجود میں آ گیا یعنی محدثین اور فقہا اور انھوں نے مرتکبِ زنا افراد تک رسائی کے سارے راستے بند کر دیے۔ اگر زنا کا کوئی مقدمہ درج ہو ہی گیا ہے تو اس ضمن میں شہادت پیش کرنے کا معیار اس طرح کا مقرر کر دیا گیا کہ ان شرائط پر پورا اترنا ناممکنات میں سے ہے۔ چنانچہ پچھلے چودہ سو برس میں سوائے ان صورتوں کے کہ کسی مرتکبِ زنا نے خود ہی اقرار نہ کر لیا ہو، زنا کا کوئی بھی مقدمہ ایسی کڑی شرائط کے سبب اپنے انجام کو نہیں پہنچ سکا۔ ایسے معاشروں میں جہاں مروّجہ ''اسلامی فقہ'' سے ہٹ کر قوانین بنا لیے گئے ہیں وہاں اس ظلم اور عُدوان کا حساب لیا جا رہا ہے۔

Marfat.com

سوال یہ ہے کہ یہ کیسا قانون ہے جو فحاشی کی روک تھام کی بجائے، اس کے انسداد اور سدِّباب کی بجائے، فحاشی کے پھیلاؤ کے لیے ایک چوردروازہ بن گیا ہے۔ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے یہ قانونِ شہادت ایجاد اور نافذ کر دیا ہے۔ مسلمان معاشرہ فحاشی کی دلدل میں کیوں دھنسا ہوا ہے۔ باہم رضامند جوڑے عیاشی کی ہر حد پار کر چکے ہیں اور جن پاکباز خواتین پر یہ ظلم توڑا جاتا ہے ان کے پاس از روئے ''شریعتِ ثابتہ'' ۔۔ وہ شریعت جو محدثین اور فقہا کی ایجاد ہے ۔۔۔ ایسے مظلوموں کے لیے کوئی راستہ نہیں، کوئی دلیل نہیں، انصاف کے حصول کی کوئی راہ نہیں کہ ان پر توڑے جانے والے ظلم کا کسی سے حساب لیا جا سکے۔

یقیناً ہم نے بہت سخت الفاظ میں فقہ اور قانونِ شہادت مرتب کرنے والوں پر بہت بڑا الزام لگایا ہے لیکن آئندہ پیش کیے جانے والے دلائل کی روشنی میں ہم یہ ثابت کریں گے کہ ایسا کہنے میں ہم حق بجانب ہیں۔ اس لیے کہ اس ضمن میں قرآنِ حکیم کا اصل مطالبہ بھی ہمارے پیشِ نظر ہے اور نبی اکرم ﷺ کا طرزِ عمل بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوا:

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ (15:4)

''تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں، ان پر اپنے میں سے چار (آدمیوں) کی گواہی لو۔''

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (13:24)

''وہ لوگ اپنے الزام (یا الزامات) کے ثبوت میں چار گواہ کیوں نہ لائے۔ اب کہ وہ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔''

اس وقت کتاب الفقہ علیٰ مذاہب الاربعۃ جزو پنجم، شرعی حدود۔ تالیف عبدالرحمن الجزیری (محکمۂ اوقاف پنجاب 1979) پیشِ نظر ہے۔ محولہ بالا آیت نقل کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

''تمام فقہا اس بات پر متفق اللفظ ہیں کہ ارتکابِ زنا کا ثبوت گواہی سے یا اقرارِ جرم سے ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ دوسرے دعووں کے خلاف اس

Marfat.com

مذموم جرم کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہ درکار ہیں۔ اس بات پر اُمت کا اجماع ہے اور ائمہ فقہ اس پر متفق ہیں کہ وہ گواہ انصاف پسند اور مرد ہوں۔ اور سزا یاب نہ ہوں اور اس شہادت کے قابلِ تسلیم ہونے کی شرط یہ ہے کہ گواہ مرد کی شرمگاہ کو عورت کی شرم گاہ میں بچشمِ خود دیکھنا بیان کرے اور اس کو واضح الفاظ میں بتائیں۔ اشاروں سے بتانا کافی نہیں۔ اس طرح کے چار گواہوں کی شرط لگانے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کا پردہ فاش نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے۔" (ص 122)

اسی بیان کے اندر علامہ الجزیری نے ایک حدیث بھی بغیر کسی سند اور حوالے کے بیان کی ہے جس میں نبیِ اکرم ﷺ سے منقول ہے: "ایسے چار آدمی لاؤ جو تمھارے بیان کی صداقت پر گواہی دیں۔" یہ الفاظ فی الواقع قرآنِ حکیم ہی کے الفاظ کی ترجمانی ہیں۔ رہی وہ وضاحت جو فعل کو ہوتے ہوئے بچشمِ خود دیکھنے کی ہے اور جو تمام فقہا کے ہاں بالا جماع مذکور ہے، سو یہ محلِ نظر ہے۔ اس لیے کہ نہ تو قرآن نے بالوضاحت ایسی کوئی شرط لگائی ہے اور نہ نبیِ اکرم ﷺ کی جانب سے گواہی دینے والے پر ایسی کوئی شرط عاید کی گئی ہے۔

محدثین اور فقہا نے کیا سوچ کر قرآن پاک اور نبی ﷺ کے مطالبے پر از خود ایسا اضافہ کیا ہے اور شہادت کے قابلِ قبول ہونے کے لیے ایسی عجیب شرط عاید کر دی ہے، اس کی حقیقت کو جاننا ضروری ہے۔ وگرنہ سب جانتے ہیں کہ کوئی کنجری بھی جب اپنے آپ کو اس کام کے لیے پیش کرتی ہے تو وہ بھی یہ کام علیحدگی میں چھپ کر کرتی ہے۔ اس کا دلاّل اور اس کی نائیکہ بھی کسی روزنِ دیوار سے نظارہ نہیں لے رہے ہوتے۔ یہ بات ہمیشہ ہی خارج از امکان رہتی ہے کہ ایک جوڑے کے حرام کاری کے عمل کو کوئی بھی شخص بچشمِ سر دیکھ رہا ہو۔

قرآنِ حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ زلیخا جو ایک آبرو باختہ عورت تھی، اس نے بھی جب حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے جال میں پھنسانا چاہا تو ایک فطری تقاضے کے مطابق:

وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۚ (23:12)

"زلیخا نے دروازے بند کر دیے اور کہا کہ اب مجھے آلو۔"

کسی بھی انداز سے، روایت و درایت کے کسی بھی معیار پر پرکھ کر اس امر کا جائزہ لے

Marfat.com

لیس تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ محدثین اور فقہا نے چار گواہوں کے اس عمل کو بچشم خود دیکھنے کی جو شرط لگائی ہے تو یہ قطعاً غیر فطری اور غیر حقیقی مطالبہ ہے۔

زنا کے ثبوت کے لیے قانونِ شہادت کا یہ رخ، ایسا غیر فطری، غیر حقیقی مطالبہ محدثین اور فقہا کا اجماعی مطالبہ کیوں کر بن گیا۔ نرم ترین الفاظ میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان اہلِ علم کو غلطی لگی، انھوں نے ایک اجتہادی غلطی کر ڈالی اس طرح کہ ماعز بن مالک اسلمی کے معاملے میں نبیِ اکرم ﷺ نے زنا کے مرتکب شخص سے جس انداز میں جرح کی تھی، محدثین اور فقہا نے انھی تفصیلات کے بیان کو شاہد کے لیے بھی ضروری قرار دے دیا۔

ماعز بن مالک اسلمی نے اپنے ایک دوست (صحابی) کے سامنے اعترافِ گناہ کیا۔ بالآخر اسے نبی ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا۔ نبی ﷺ نے پوری تسلی کر کے کہ یہ شخص بالغ ہے، دیوانہ نہیں، اس نے شراب نہیں پی رکھی، بقید ہوش وحواس ہے، ماعز بن مالک سے پوچھا کہ تمھیں علم ہے کہ یہ عمل کیا ہوتا ہے۔ کیا تم نے ایسا ہی کام کیا ہے جیسے سرمہ دانی میں سلائی ڈالی جاتی ہے۔۔ وغیر وغیرہ۔ عیاں ہے کہ یہ سارے سوالات، یہ ساری جرح ''فاعل'' سے کی جارہی ہے نہ کہ شاہد سے۔ اب اگر یہی تمام سوال کسی شاہد سے کیے جائیں جبکہ کسی بھی شاہد کے لیے اس عمل کو بچشمِ سر دیکھنے کے امکانات کالمعدوم ہوتے ہیں تو یہ مطالبہ کس طرح جائز قرار دیا جائے گا۔ پھر ایسے ہی چار چشم دید گواہوں کا موجود ہونا۔۔۔ کیا یہ ایک حقیقی اور فطری مطالبہ ہوگا۔۔۔ قطعاً نہیں۔

❁❁❁❁

ہم سمجھتے ہیں کہ اس غلط فہمی کے۔۔۔ اس غلط اجتہاد کے پسِ پشت ایک اور اُلجھن بھی ہے۔ قرآن پاک کی اصطلاح ''شاھد'' کے محدود معنی ۔۔۔ چشم دید۔۔ بھی۔ محدثین اور فقہا کے مددگار بن گئے۔ ایک دنیا اس بات سے آگاہ ہے کہ جس دور میں یہ پانچوں فقہ مرتب ہو رہی تھیں، سلاطین اور امرا کے ذاتی حالات بڑے ہی دگرگوں تھے۔ ذاتی بیت المال، بڑے بڑے محلات، بیویوں، خادماؤں، کنیزوں اور غلام عورتوں کی بھرمار، عیاشی اور فحاشی کے ان گنت مواقع، عوام الناس کی پہنچ سے دور یہ حکمران اپنی عیاشیوں کے لیے ایسے قوانین کے حاجت مند تھے کہ عدالت کا ہاتھ ان کے گریبان تک کبھی نہ پہنچ سکے۔ زنا کاری کا جو بازاران امرا نے گرم کر رکھا تھا اور ان کے حواری بھی اس میں پوری طرح شریک تھے، اس کو تحفظ دینے

Marfat.com

کوڑے مارے کھلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ آیت میں پیش کردہ صورتِ حال زانی اور زانیہ کی سزا پا لینے کے بعد کی بیان ہوئی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ شرعی سزا پا لینے کے باوجود یہ افراد، مؤمنین پر بطورِ زوج حرام ہیں۔ پھر ایسے معاملات میں بیشتر حقوق العباد کا مسئلہ بھی ہوتا ہے، اس پہلو سے صرفِ نظر کر کے توبہ کیسی!

مزید وضاحت کے لیے عرض ہے کہ ''احکامُ القرآن'' میں قاضی ابو بکر نے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم کے کچھ فیصلے نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخین نے زانی اور زانیہ کو سزا دینے کے بعد ان کی آپس میں شادی کر دی۔ اس طرح عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ زانی اور زانیہ پاکباز مؤمنین کے برابر کا درجہ نہیں پا سکتے۔

❁❁❁❁

مفسرینِ قرآن اور فقہا عظام نے جو قانونِ شہادت بیان فرمایا ہے اس میں بہت بڑی غلطی لفظ ''شاہد'' کے درست معانی متعین نہ کر سکنے کی وجہ سے کی گئی ہے۔ شاہد کے معنی لغت کے اعتبار سے ملاحظہ فرمائیں:

......وہ جاننے والا کہ جو جانے بیان کر دے (تاج العروس)

......احوال کہنے والا، تعلیم ربّانی بتانے والا (لغات القرآن۔ عبدالرشید نعمانی)

......وہ شخص کہ جو کچھ اس کے علم میں ہے، بیان کرے (مختار الصّحاح)

......جو واقف ہو، جسے علم ہو، گواہی دینے والا (المنجد۔ اُردو)

......جو کسی بات سے مطّلع ہوا، جو علم اس کے پاس تھا آگے بیان کر دیا۔ (لاروس)

...... پکّی، قاطع اطلاع دینے والا (اقرب الموارد)

......جو شہادت کسی کے پاس تھی اسے پورا ادا کرنے والا (الرّائد)

......شاہ ولی اللہ نے ''شاہد'' کے معنی یوں لکھے ہیں: ''اظہارِ حق کنندہ''

شاہد اور شہادت کی یہی وہ اصل تعبیرات ہیں جن کا لحاظ مروّجہ قانونِ شہادت بنانے والوں نے نہیں رکھا۔ قران حکیم سے بھی ''شاہد'' کے انھی معانی کی بخوبی تصدیق و تائید ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مبین میں (معروف معنوں میں) ''حدود'' کے ایک مقدمے کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہی واقعہ ہے جب زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے جال میں پھنسانا چاہا۔

Marfat.com

حضرت یوسف بفضلِ تعالیٰ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ دروازے پر زلیخا کا شوہر آموجود ہوا۔ زلیخا نے فی الفور حضرت یوسف پر الزام لگا دیا۔ اس شخص نے جو اپنی بیوی کی حرکات سے بھی واقف تھا اور یوسف کی عصمت بھی اس کی نگاہ میں تھی، زلیخا کے ایک عزیز، سیانے شخص سے کہا کہ زلیخا اس طرح کہتی ہے۔ ادھر یہ بھی سچ ہے کہ یوسف کی قمیص بھی پھٹی ہوئی ہے۔ اس پر مردِ زیرک نے جواب دیا کہ اگر قمیص سامنے سے پھٹی ہے تو یوسف گنہگار ہے اور اگر یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو زلیخا مجرم ہے۔ عیاں ہے کہ اس شخص نے جو موقع کا گواہ نہیں تھا، جس نے اس واقعے کو اپنی چشمِ سر سے نہیں دیکھ رکھا تھا، ایک اُصولی، حق بات کہہ دی جس پر زلیخا کے شوہر نے درست نتیجہ اخذ کرتے ہوئے یوسف علیہ السلام کو بری الذّمہ قرار دے دیا۔ قرآنِ پاک نے اس سیانے شخص کی بات کے بارے میں ارشاد فرمایا:

شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا (26:12)

"زلیخا کے گھر والوں میں سے ایک شاہد نے شہادت دی۔"

راغب اصفہانی جسے ایک ایک لفظ کے کئی کئی معانی لکھنے کا جنون ہے اور جس نے پانچویں صدی ہجری میں اپنے پیشرو مقاتل بن سلیمان (المتوفّٰی 150ھ) کی "الوجوہ والنّظائر" کو توسیع بخشی اور اس طرح مفسرینِ قرآن کے لیے تفسیر بالرّائے کی راہیں ہموار کیں، اس مقام پر بھی اپنی مخصوص حرکت سے باز نہیں آیا۔ مفردات القرآن میں راغب نے لکھا ہے:

"شہادت کو حکم یعنی فیصلے سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔"

راغب نے یہ الفاظ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا کی تفسیر میں لکھے ہیں حالانکہ بات بالکل واضح ہے کہ شاہد نے اپنی رائے بیان کی تھی، اعلانِ حق کیا تھا، واقعاتی شہادت کس طرح قبول یا ردّ کی جاسکتی ہے، اس کا بیان تھا، اس شخص نے فیصلہ نہیں سنایا تھا۔ آج کے دور میں بھی واقعاتی شہادتیں اور میڈیکل رپورٹ شہادت کا اسی طرح نعم البدل بن سکتی ہیں۔

اگر کسی عورت کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور عیاں ہے کہ اُس کے پاس موقع کے چشم دید چار گواہ الزام ثابت کرنے کے لیے موجود نہیں تو از روئے شرع ایسا ہرگز نہیں کہ وہ اپنے گھر میں خاموش بیٹھی آنسو بہاتی رہے اور مجرم معاشرے کی دیگر خواتین کو بھی نشانۂ ہوس بنانے کے لیے دندناتا پھرے۔۔۔ بلکہ اس کا حل موجود ہے۔ فی الفور طبّی معائنے یا بعد از حمل DNA

Marfat.com

تلاش میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صرف یہ بتایا ہے کہ انبیا اور شہدا یہ اعلان کریں گے کہ ان مجرموں کو انھوں نے حق کا پیغام پہنچا دیا تھا۔

❁❁❁❁

ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شاہد اور اس کے مبالغے کے صیغے شہید کے ایک ہی بنیادی معنی ہیں: ''بتانے والا، اعلانِ حق کرنے والا۔'' اور ہم اس بات پر بھی مصر ہیں کہ قرآن پاک میں ہر جگہ شاہد اور شہید کی یہ اصطلاحات انھی معانی میں استعمال ہوئی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ کہیں کوئی معنی ہو اور کہیں کوئی اور معنی! اسی بات کی مزید وضاحت کے لیے قرآنِ حکیم کے مختلف مقامات پر اس اصطلاح کے استعمال کی، اُردو زبان میں انھی معانی کی روشنی میں جو ہم نے متعین کیے ہیں، تعبیر پیش کی جا رہی ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (18:3)

اس آیت کا معروف ترجمہ یہ ہے:

''اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔''

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس قاضی کی عدالت میں گواہی دینی ہے اور کس حاکم کے سامنے شہادت دے کر کونسا فیصلہ کس حاکم سے کروانا ہے۔ عیاں ہے کہ جسے گواہ کہا جائے وہ قاضی یا حاکم نہیں ہو سکتا، وہ فیصلہ کرنے والا نہیں ہو سکتا۔

اس آیۂ مبارکہ کا اصل ترجمہ یوں ہو سکتا ہے:

''اعلان فرماتا ہے اللہ کہ اس کے علاوہ کوئی اِلٰہ نہیں۔''

ایک اور مقام پر قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوا:

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (1:63)

''اور اللہ تعالیٰ منافقین کے جھوٹے ہونے کا اعلان کرتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ اپنی کہی ہوئی بات کی عظمت کو اس طرح بیان فرما رہا ہے:

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ ۣ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ (19:6)

اس آیۂ مبارکہ سے پہلے یہ بتایا گیا کہ نقصان پہنچانے والا صرف اللہ ہے اور کوئی اس میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتا اور بھلائی دینے والا بھی وہی ہے۔ پھر ارشاد ہوا کہ یہ تمام باتیں جو اس

Marfat.com

طرح کھول کر بیان کی جارہی ہیں۔

”تو ذرا بتاؤ تو سہی کہ کس کی کہی ہوئی بات زیادہ وزنی ہے۔ کہہ دو کہ میرے اور تمھارے درمیان حق کی بنیاد پر فیصلہ کن بات کرنے والا تو بس اللہ ہی ہے۔“

پھر ارشاد ہوا کہ آپ کو یعنی نبی ﷺ کو قرآن کے ذریعے سب کچھ کھول کر بتا دیا گیا ہے تا کہ اس طرح آپ ﷺ کو خبردار کروں اس قرآن کے ذریعے سے اور جس شخص تک یہ قرآن تا قیامت پہنچے، وہ بھی حق سے آگاہ ہو جائے

أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ آلِهَةً أُخْرَىٰ ۚ قُل لَّا أَشْهَدُ (19:6)

”کیا تم یہ اعلان کرتے ہو کہ اللہ کے علاوہ بھی دوسرے اِلٰہ ہیں۔ اے نبی ﷺ ان سے کہہ دو کہ میں تو یہ اعلان واقرار کرنے والا نہیں۔“

سورۃ الانعام میں حرام وحلال اور توحید وشرک کی بحث کرتے ہوئے آخر میں فرمایا:

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَاءَكُمُ الَّذِينَ يَشْهَدُونَ أَنَّ اللَّهَ حَرَّمَ هَٰذَا ۖ فَإِن شَهِدُوا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ (150:6)

”اے نبی ﷺ کہہ دیجیے کہ تم اپنے ان بتانے والوں کو لے آؤ جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اس بات کو حرام قرار دیا ہے۔ پھر اگر وہ یہ اعلان کر بھی دیں تو آپ ﷺ ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں۔“

شاہ عبدالقادر ؒ نے اس آیت کے ترجمے میں تین مقام پر ”بتادو“ کے ہی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ بار بار حضرت شاہ صاحب کا ترجمہ قرآن دیکھ کر یہ احساس ہوا کہ یہی ترجمہ قرآن کے اصل معانی سے قریب ترین ہے

اہلِ کتاب کے علما توحید ورسالت کے مختلف معاملات میں اپنی کتابوں سے ہی پڑھ کر حقیقتِ واقعہ سے بخوبی آگاہ تھے لیکن محض اپنی ہٹ دھرمی کی بنا پر ان باتوں کو چھپا کر حق کا انکار کر دیتے تھے، اسی لیے فرمایا:

لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ (70:3)

”تم اللہ کی آیات سے کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم بخوبی آگاہ ہو۔“

Marfat.com

کوڑے مارنا ہیں اور سرِ عام مارنا ہیں۔ اس کا انکار اور ان احکامات کا تمسخر اور انھیں خلافِ انسانیت قرار دینا، انھیں انسان کی تذلیل قرار دینا، اس خالق و مالکِ حقیقی کے خلاف بغاوت ہے جو انسان کو پیدا کرنے والا ہے، جو اس کی ضروریات سے آگاہ ہے اور جسے علم ہے کہ شرفِ انسانیت زنا کاری میں نہیں بلکہ اس گھناؤنے عمل سے روکنے، اس کے موجبات کو ختم کرنے اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو عبرتناک سزائیں دینے میں ہے۔

❁❁❁❁

رہی یہ بات کہ جن اُمور پر ہم نے ائمہ کے موقف سے اختلاف کیا ہے اس کا ہمیں کوئی حق نہیں اس لیے کہ انھی اُمور پر صدیوں سے سبھی ائمہ متفق ہیں اور ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ''اجماع'' بھی شرع کا مستند اُصول ہے اور جن اُمور پر علما کا اجماع ہو چکا ہے انھیں ردّ نہیں کیا جاسکتا تو اس کا جواب حاضر ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس اُصول کی کوئی بنیاد نہیں۔ جب نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجنا چاہا تو ان سے دریافت کیا کہ تم مسلمانوں کے معاملات کس طرح چلاؤ گے۔ حضرت معاذ نے جواب دیا کہ کتاب اللہ کے ذریعے۔ اس میں سے رہنمائی نہ ملے تو اسوۂ رسول کریم ﷺ سے اور وہاں سے بھی کوئی طے شدہ بات نہ ملے تو ۔۔۔ فاجتهد بنفسي ۔۔۔ پھر میں اجتہاد کروں گا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان تینوں اُصولوں کی توثیق کردی۔ اب فقہا ہمیں بتاتے ہیں کہ کتاب و سنت کے بعد تیسرا اُصول قیاس ہے چوتھا اجماع اور پانچواں اجتہاد وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ قیاس تو اجتہاد ہی کا ایک شعبہ ہے اور رہا اجماع تو اس کی حقیقت جاننے کے لیے ہمیں ان دلائل کا جائزہ لینا ہوگا جو اجماع کے حق میں پیش کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صبحی محمصانی نے اپنی کتاب فلسفۂ شریعتِ اسلام میں صدیوں سے مرتب کیے جانے والے وہ تمام دلائل اکٹھے کر دیے ہیں جن کی بنیاد پر ان کی رائے میں ۔۔۔ ''جمہور فقہا کے نزدیک کتاب وسنت کے بعد اسلامی قانون کا تیسرا ماخذ اجماع شمار ہوتا ہے۔'' (ص 177)

اور فرماتے ہیں:

''کسی حکمِ شرعی پر کسی زمانے میں مسلمان مجتہدوں کا متفق ہونا اجماع کہلاتا ہے۔''

Marfat.com

اس ضمن میں فقہاءِ اسلام کی پہلی دلیل قرآنی آیت سے لی گئی ہے:

''جو شخص سیدھا راستہ ظاہر ہونے کے بعد رسول ﷺ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایسی راہ اختیار کر لے جو مؤمنین کی راہ نہیں ہے تو ہم اسے اسی طرف متوجہ رکھیں گے جس طرح اس کا رخ ہے اور اسے جہنّم میں داخل کریں گے جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔'' (115:4)

اس آیت میں سبیلُ المؤمنین کی وضاحت کرتے ہوئے اسے الھدیٰ اور رسول کا راستہ بتایا گیا ہے نہ کہ مؤمنین کے راستے کو اللہ اور اس کے رسول کا راستہ۔ یہ آیت خود یہ واضح کرتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے راستے سے ہٹ جانے والے سبیلُ المؤمنین پر نہیں ہیں۔

دوسری آیت سورۃ النساء کی آیت 59 ہے جس میں مؤمنین کو اللہ اور رسول اور اُولی الامر کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے۔ نہ جانے اس آیت سے اجماع کیسے برآمد ہو گیا۔ تیسری آیت جو اجماع کے حق میں پیش کی جاتی ہے، یہ ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (103:3)

''اور اللہ کی رسی (اللہ کا دین۔ کتاب وسنت) کو مضبوطی سے پکڑ لو اور الگ الگ نہ ہو جانا۔''

جان لینا چاہیے کہ اس آیت میں اصل زور اعتصام بحبلِ اللہ پر ہے۔ یہی وہ اُصول ہے جسے ترک کر دینے پر اُمت تفرقے کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس فقہا کی دلیل یہ ہے کہ جب علما کسی بات پر متفق ہو جائیں تو ان سے اختلاف ظاہر کر کے تفرقہ پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ الٹی منطق ہے۔ علما سے یہ پوچھنا ہو گا کہ جس جس بات پر تم اجماع کا مظاہرہ کر رہے ہو، اس کے لیے حبلُ اللہ سے کافی دلائل تمھارے پاس موجود ہیں یا محض اپنے اجماع کی دھونس سے ہی کام چلانا چاہتے ہو۔

احادیث میں سے صرف ایک حدیث کا سہارا لیتے ہیں:

اُمَّتِیْ لَاتَجْمَعُ علی الخطاء اَوعلی الضّلالۃ

''میری اُمت غلط بات یا گمراہی پر اکٹھی نہیں ہو گی۔''

ابنِ حزم نے کہا ہے کہ اس روایت کے الفاظ اور اس کی اسناد درست نہیں۔ اس کے

Marfat.com

یہ ہیں مؤمنین جو اللہ کی مقرر کردہ حدود کی حفاظت کرتے ہیں، اے نبی ﷺ انھیں بشارت دے دو۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ''حدود''، ''حدود آرڈیننس'' اور ''حدود قوانین'' ہمارے معاشرے میں بدنام کر دیے گئے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عوام النّاس کو بتایا گیا ہے کہ ''حدود'' کا معنی ہے کوڑے مارنے اور ہاتھ کاٹنے کی سزائیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کہیں کسی خاتون پر کوئی ظلم و زیادتی ہوئی ہو تو چار چشم دید گواہ میسر نہ آنے کی وجہ سے کسی خاتون کے حقوق کو تحفظ نہیں ملتا۔

اس کے مقابلے میں ملاحظہ ہوں قرآنِ حکیم کی متعدّد آیات جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی مقرر کردہ ''حدود'' کا ذکر فرمایا ہے، وہاں درحقیقت زیادہ تر ایسے ہی معاملات کا تذکرہ ہے جن سے خواتین کے حقوق کو تحفظ ملتا ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم محض اشارات پر اکتفا کریں گے۔

سورۂ البقرہ (229) میں طلاق کا طویل طریقِ کار مقرر کر دیا گیا تا کہ کوئی شخص یکبارگی تین طلاقیں دے کر جلد بازی میں اپنی عورت کو گھر سے نکال باہر نہ کرے اور اس کو حدود اللہ قرار دیا گیا۔ (افسوس کہ یہ حد علما کی زیرِ نگرانی پامال ہو رہی ہے) سورۂ البقرہ (230) میں عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھ کر ٹھوکر مار دینے والے جلد باز مردوں کو جو بعد میں اپنی حماقت پر شرمندہ ہو کر رجوع کرنا چاہتے ہیں، ایک ایسا راستہ بتایا گیا جسے پہلے سے طے کر کے از خود اختیار کرنا بھی حرام ہے اور کسی دوسرے مرد کی آغوش سے ہو کر واپس آنے والی خاتون کو اسی پہلے انداز میں قبول کرنا بھی مردوں کے لیے بہت مشکل ہے! اس ہدایت کو از خود طے کردہ راستے ''حلالہ'' کے اس عمل کو (جس کا مجوّزہ راستہ کسی عالم کے حجرے سے ہو کر گزرتا ہے) اس طرح قبول کرنے کو حدود اللہ کی پامالی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سورۂ النساء آیات 14،13 میں وراثت کے مسائل بالتفصیل بیان کرنے کے بعد اللہ کی مقرر کردہ ان حدود کو پامال نہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ وراثت کے ان مسائل کے ذریعے عورتوں کو جنھیں صدیوں سے وراثت سے محروم رکھا جاتا تھا، جائز وارث بنایا گیا، ان کے حصے ورثے میں مقرر کر دیے گئے۔ اس طرح عورتوں کے حقوق کو تحفظ دیا گیا ہے۔ سورۂ المجادلہ (آیت 4) میں ان لوگوں کو اللہ کی مقرر کردہ حدود کو پامال کرنے پر سرزنش کی گئی ہے جو بیٹھے بٹھائے اپنی بیویوں کو مائیں کہہ کر ان کے فطری حقوق سے محروم کر دیتے ہیں۔ سورۂ الطلاق کی پہلی آیت میں ارشاد ہوا کہ اگر تم عورتوں کو طلاق

Marfat.com

دے دو تو اُن کی عدّت کا حساب رکھو اور اس دوران میں انھیں اپنے گھروں سے نہ نکالو۔ یہ بھی حدود اللہ ہیں۔

ان تمام آیات میں ''حدودُ اللہ'' گویا کہ عورتوں کے حقوق کی حفاظت ہی کا دوسرا نام ہے۔ سورۂ المومنون کے شروع میں مؤمنین کی نشانیاں گنوائی گئی ہیں۔ انھی میں یہ بھی ارشاد ہوا کہ مومن وہ ہیں جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور جو اس کے علاوہ (اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی حدود کی حفاظت نہ کرتے ہوئے زنا کا مرتکب ہو) تو وہی حد پار کرنے والے ہیں۔ کیا یہ منکوحہ خواتین کے حقوق کی حفاظت نہیں ہے!

اللہ تعالیٰ کے احکامات بالکل واضح ہیں لیکن فقہا اور محدثین کی غلط تعبیرات کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ حدود اللہ کی پامالی سے مؤمنین کو روکنے کی بجائے انھیں حدود کے انتہائی خوفناک اور عبرتناک مفہوم سے آشنا کر دیا گیا ہے۔ دین کے اصل مقصد سے دور بھگانے کا یہ اہتمام معاشرے کی اصلاح میں رکاوٹ ہے۔ زنا جیسے بھیانک جرم کو صاف صاف حدود اللہ کی پامالی جان کر اسے ختم کرنے کی مساعی کے بجائے فقہا یہ تلقین کرتے ہیں کہ اسے چھپانے کا اہتمام کیا جائے، زناکاروں کو اپنا کام کرتے رہنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے اور ایسی تراکیب وضع کی جائیں کہ زنا معاشرے کے رگ و پے میں جاری و ساری رہے۔ ہماری استدعا ہے کہ دونوں قرآنی اصطلاحات ''شاھد'' اور ''حدودُ'' کے درست معانی کو رواج دے کر اللہ کی منشا کو پورا کیا جائے۔

Marfat.com

Marfat.com

توضیحات بسلسلہ شہادت

اگرچہ دین اسلام کے تمام قواعد وضوابط جو ہمیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے دیے ہیں ایسے قوانین ہیں جن سے بغاوت غارت گرِ ایمان ہے تاہم اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں اپنے بعض احکام کے بارے میں خاص طور پر فرمادیا ہے کہ یہ حدود اللہ ہیں کوئی انھیں پامال کرنے کی کوشش نہ کرے:

1 یک بارگی تین طلاقیں دینا منع ہے، دوبار طلاق دے کر رجوع کرنا، عورت مرد کا ایک دوسرے کو گھر بسائے رکھنے کے بہترین مواقع فراہم کرنا اور پھر صلح صفائی کے ساتھ الگ ہوجانا، عورت کے حق مہر کو جبراً ضبط نہ کرنا......ان اُمور کو حدود اللہ قرار دیا گیا۔ (البقرہ 229)

2 وراثت کے احکام بتا کر، جن میں عورت کو بھی وارث بنایا گیا اور ورثا کو یتیموں کے اموال کھانے سے روکا گیا ہے، ارشاد ہوا کہ وراثت کی تقسیم انھی اُصولوں پر ہونی چاہیے، یہی حدود اللہ ہیں۔ (النساء 13)۔

3 عورتوں کو ان کے حقوق سے یہ کہہ کر محروم کردینا جھوٹی اور نامعقول بات ہے کہ تم میری ماں ہو اور اگر غلطی سے ایسا کہہ بیٹھے تو اس کا کفارہ اسی طرح ادا کرنا ہے جس طرح اللہ نے فرمایا ہے، یہی اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں۔ (المجادلہ، 16)

4 سورۂ الطلاق کے شروع میں عورتوں کو طلاق دینے کا طریقہ (تین طلاقیں، تین حیض کے دوران میں) اور اس کا درست وقت بتایا گیا ہے اور اس دوران میں عورت کو گھر سے نکال باہر کرنے سے منع کیا ہے پھر فرمایا کہ یہ حدود اللہ ہیں، خبردار ان سے تجاوز نہ کرنا۔

Marfat.com

5 اسی طرح ناجائز طور پر خواہش نفس پوری کرنے والوں کے بارے میں فرمایا کہ یہی ہیں جو اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہیں۔ (المومنون)

ان تمام مقامات پر بالخصوص جہاں حدود اللہ کے الفاظ آئے ہیں احکام الٰہی ہی کا ذکر ہے نہ کہ کسی بھی قسم کی سزا کا۔ اب اگرچہ فقہائے اسلام نے "حد" کو سزا کے مترادف کے طور پر ایک قانونی اصطلاح بنالیا ہے تاہم یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ اس اصطلاح کے نفاذ کے بارے میں فقہا باہم متفق اللفظ نہیں ہیں۔

الف۔ کتاب الفقہ میں (شیخ الجزائری) فرماتے ہیں کہ حنفیہ کی نظر میں حدود یعنی شرعی سزائیں صرف وہ ہیں جو قرآن سے ثابت ہیں اور وہ پانچ ہیں۔ (زنا کی سزا سو کوڑے مارنا، چوری کی سزا قطع ید، شراب نوشی کی سزا اسّی کوڑے مارنا، راہزنی کی سزا قتل یا سولی، ہاتھ پاؤں کاٹنا اور جلا وطن کر دینا اور تہمت یعنی قذف کی سزا، کوڑے مارنا) واضح ہو کہ شراب نوشی سے متعلق تمام آیات قرآنی میں ان احکام کے حدود اللہ ہونے کا ذکر بھی نہیں ہے اور نہ ہی قرآنِ حکیم میں اس کے لیے کوئی سزا مقرر کی گئی ہے۔ مطلب کہنے کا یہ نہیں کہ شراب نوشی لائقِ تعزیر نہیں بلکہ اس وضاحت کا مقصد فقط اس قدر ہے کہ احناف نے اپنے اُصول (وہ سزائیں جو قرآن میں مذکور ہیں، انھیں حدود کہا جائے گا) سے خود ہی انحراف کیا ہے۔ (حضور ﷺ نے شراب نوشی پر چالیس کوڑے لگانے کا حکم دیا تھا)۔

ب۔ عبدالرحمن الجزائری (کتاب الفقہ) لکھتے ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ میں سزاؤں کی تین قسمیں ہیں:

الحدود: وہ سزائیں جنھیں نافذ کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے بطور فریضہ دیا ہے اور جنھیں معاف کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ زنا (بدکاری) سرقہ (چوری) قذف (الزام تراشی) اور شراب نوشی

قصاص: مجرم کے جرم کے لحاظ سے اس کے ساتھ سلوک۔ وضاحتاً فرماتے ہیں "قصاص کو حد نہیں کہا جائے کیونکہ یہ سزا حقوق العباد میں سے ہے اور مدعی کو اختیار ہے کہ اسے معاف کردے" (ص 14)

Marfat.com

(شیخ کو یاد رکھنا چاہیے تھا کہ سرقہ کی کمیت وکیفیت کے لحاظ سے قطع ید کا مثبت ومنفی فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور معاملات کی سنگینی بھی قطع ید میں نرمی برتنے کا وسیلہ بن سکتی ہے)۔

تعزیر: ایسے جرم کی سزا جن پر نہ حد (قرآنی سزا) عائد ہوتی ہو اور نہ اس کا کفارہ (شرعی تاوان) عائد ہوتا ہو۔ (ص 14)۔

ہمارا کہنا یہ ہے کہ قصاص کے تحت آنے والے معاملات کی طرح زنا کاری بھی حقوق العباد سے متعلق ہے اس لیے الجزائری کے قاعدے کی رو سے زنا کاری کی سزا بھی "حدود" کے دائرے سے خارج ہونی چاہیے۔ یہی معاملہ سرقے کا بھی ہے۔ بلکہ قذف (دوسروں پر جھوٹی تہمت لگانا) تو صریحاً حقوق العباد کی تلفی ہی کے زمرے میں آتا ہے...... دوسرا اعتراض اس تقسیم پر یہ عائد ہوتا ہے کہ قصاص کے زمرے میں آنے والے قتلِ عمد اور قتل خطا کی سزائیں تفصیل کے ساتھ قرآن میں مذکورہ ہیں۔ بالخصوص قتل عمد کے مرتکب کو صراحتاً فی النار کہا گیا ہے چنانچہ اس کے لیے تو دیت کی رعایت بھی نہیں بنتی۔ (مقتول ہی اصل شخص ہے جس کی حق تلفی ہوئی۔ اگر کسی جرم کو معاف کرنا ہو تو حقوق العباد کا تقاضا یہی ہے کہ براہ راست متاثر ہونے والا شخص ہی ایسا کرے، مگر یہ ناممکن ہے) اور قرآنی آیات اس بات پر شاہد ہیں کہ قتلِ عمد میں معافی کا کوئی گوشہ نہیں...... چنانچہ قصاص کو (انھی دونوں وجوہ کی بنا پر) پہلی قسم (الحدود) سے کیسے الگ کیا جا سکتا ہے۔ شیخ کا یہ کہنا بھی ناقابل فہم ہے کہ شراب نوشی بھی ایسا جرم ہے جس کی سزا اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادی ہے کیونکہ قرآن میں ایسا حکم کہیں نہیں آیا۔ شیخ الجزائری کی تمام وضاحتیں بیکار ہیں۔ الحدود کے تحت آنے والے جرائم ممنوعہ بھی ہیں اور ضرر رساں بھی...... ہمارا کہنا یہ ہے کہ یہ اصطلاح...... "حدود"...... فی نفسہٖ غلط ہے۔ اس کی بنیاد پر کوئی تقسیم وتفریق درست ہو ہی نہیں سکتی...... سزا کے لیے اگرچہ قرآن نے جزا اور ثواب کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں مگر اصل لفظ "نکال" ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> "چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ بدلہ ہے (جزاء) اُس کا جو انھوں نے کیا۔ عذاب (اور سزا...... نِکالاً) ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ قوت وحکمت والا ہے"۔ (38:5)

ج۔ امام شافعی نے مختصر المزنی میں اس طرح باب باندھے ہیں:

Marfat.com

کتاب الحدود (زنا اور قذف)

کتاب السّرقہ (راہزانی اور مسکرات اور مرتدین)

کتاب القتل (اور اسی کے تحت کتاب القسامہ)

د۔ مالکیہ کے نمائندے نے ''حاشیۃ الصحاوی علیٰ شرح الصّغیر'' میں قصاص کا ذکر بابُ الحدود یعنی شرعی سزاؤں میں نہیں کیا، حالانکہ قتل کی سزا قاتل کو قتل کر دینا صراحتاً قرآن میں مذکور ہے۔ یا پھر قتلِ خطا کی صورت میں دیت کی ادائیگی اور یہ بھی قرآن نے ورثا پر فرض کر دی ہے......اس طرح قصاص کی تکمیل شرعی سزاؤں سے ہی ہو سکتی ہے۔

ہ۔ شیخ شعرانی نے المیزان میں یہ تقسیم اس طرح کی ہے:

کتاب الجنایات: فوجداری جرائم

کتاب الدّیات: تاوان، جرمانہ، حلف، قتل کا کفارہ

کتاب الحدود: جرائم کی سات شرعی سزائیں

ارتداد، باغیِ ریاست، زنا، قذف،

سرقہ، راہزنی، مسکرات (سات شعبے)

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فقہائے اسلام نے جب قرآنی اصطلاح ''نکال'' کو چھوڑ کر (جو ہر طرح کے جرم اور گناہ کی سزا کی تعریف ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے) غیر قرآنی اصطلاحات اختیار کر لیں تو یہ سب لوگ کس طرح تفرقے میں پڑ گئے۔ اب احناف اور مالکیہ، شافعیہ کے مذاہب آپس میں کسی بھی طرح نہیں ملتے۔ یہی فرقہ داری جسے قرآن نے شرک قرار دیا ہے، ان سب کے فکر کا طرۂ امتیاز ہے۔

دوسرا معاملہ جس کی وضاحت مقصود ہے، زانی کی سزا سے متعلق ہے۔ عیاں ہے کہ ریاستِ مدینہ میں زنا سے متعلق پہلا مقدمہ یہودی قبیلے والے آپ ﷺ کی عدالت میں لے کر آئے اور آپ ﷺ نے ان پر ثابت کر دیا کہ اُنھی کی آسمانی کتاب (توریت) میں زانی کے لیے رجم کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ ازاں بعد (سورۃ النور کی آیات کے نزول سے پہلے اور غالباً ان کے نزول کے بعد بھی جیسا کہ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے ثابت ہے) آپ ﷺ

Marfat.com

نے غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے سو کوڑوں کو قرآنی سزا اور شادی شدہ کے لیے رجم کی سزا پر اصرار جاری رکھا۔

اس ضمن میں ایک حدیثِ مبارکہ کا حوالہ ضروری ہے جس میں ارشاد ہوا ''کہ شادی شدہ مرد عورت کے لیے رجم کی سزا اللہ کا دیا ہوا قانون ہے''۔ اس حدیث کے الفاظ ''فی کتاب اللہ'' سے یہ مراد لے لینا کہ ایسا قرآنِ حکیم میں آیا ہے، قطعاً نا سمجھی کی بات ہے (اور پھر اس کے ثبوت کے لیے ایک نام نہاد منسوخ آیت بھی گھڑ لینا، سراسر بہتان ہے) اصل میں الشّیخ والشّیخہ کے الفاظ کا نبیِ اکرم ﷺ کے اپنے الفاظ ہونا ایک روایت سے گمان کیا جاسکتا ہے، یہ الفاظ آیۂ قرآنی نہ تھے، نہ ہیں اور نہ ان اصطلاحات کو ایسے معانی میں (یعنی شادی شدہ کے لیے) قرآن میں استعمال کیا گیا ہے۔ لطف کی بات ہے کہ اس متفق علیہ روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا! الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموھما البتة نکالاً من اللہ۔ انھیں رجم کرو، سزا ہے (نکالاً) اللہ کی طرف سے (حد نہیں کہا گیا)۔

جب یہ بات ثابت ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے نہ صرف یہ کہ کوڑوں کی سزا دی بلکہ رجم کی سزا بھی دی اور پھر اس سزا کو ''فی کتابِ اللہ'' اللہ کا دیا ہوا قانون بھی قرار دیا...... تو یہ تفریق قطعاً لایعنی ہو جاتی ہے کہ حدود اور ہیں اور تعزیر اور ہے۔ بہر حال ہر طرح کی سزا کو قرآنِ حکیم اور حدیثِ رسول ﷺ میں نکالاً کہا گیا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ شرعی سزاؤں کے درمیان صرف ایک ہی طرح کی تقسیم مناسب ہے۔ اولاً وہ سزائیں جو قرآن میں مذکور ہیں اور ثانیاً وہ سزائیں جو نبیِ اکرم ﷺ نے وقتاً فوقتاً نافذ فرمائیں۔ دونوں قسم کی سزاؤں کی فرضیت میں فرق نہیں۔ اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ آپ ﷺ کی طے کردہ سزاؤں میں حالات کے مطابق ان کی نوعیّت اور شدّت میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے زکوٰۃ اور عُشر کی شرح میں حالاتِ کار کی وجہ سے کمی بیشی خارج از امکان نہیں۔ اگرچہ زکوٰۃ اور عشر ہر حال میں فرض ہی رہیں گے۔ اس ضمن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا رویہ مناسب سمت میں رہنمائی کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر شراب نوشی کی بھر پور مذمت قرآنِ حکیم میں موجود ہے تاہم اس پر سزا قرآن نے ہمیں نہیں سکھائی بلکہ نبی ﷺ نے مجرم کو چالیس کوڑے لگانے کی سزا دے کر رہنمائی عطا فرما دی۔ چنانچہ صحابہ نے (جب احوال کچھ اور دگرگوں ہونے

Marfat.com

لگے تو) اس سزا کو اسّی کوڑوں تک بھی بڑھا دیا۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے چرس، افیون، بھنگ اور ہیروئین کے عادی مجرموں کو دس بیس سے لے کر سو کوڑے تک رسید کیے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح رجم کا معاملہ بھی قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ نبی اکرم ﷺ کے دور میں یہودی (اسلامی) شریعت پر عمل کرتے ہوئے اس سزا کو پہلی بار نافذ کیا گیا۔ اس طرح مدینہ کے شہری اس سزا سے بھی متعارف ہوئے اور اس کے اچھے اثرات سے بھی، دس برس کے دوران میں (نبی ﷺ کی موجودگی میں) اس سزا پر صرف چند بار عمل ہوا (غالباً 5 بار) پھر ایسا ہوا کہ اجنبی معاشروں کے افراد کی کثرت ہوگئی اور اس طرح کی سزاؤں (رجم اور سولی دینے) پر عمل کرنا مشکل تصور کر لیا گیا۔ آج بھی اگر دیگر قرآنی سزاؤں پر مکمل عمل ہو، رجم، سولی وغیرہ سزاؤں کو صحیح اسلامی معاشرے کی تشکیل تک مؤخر کر دیا جائے تو یہ شرع سے بغاوت تصور نہ ہوگا۔ اور ہمیں ایسے طرزِ عمل میں سنتِ ثابتہ سے اعراض کا شائبہ بھی دکھائی نہیں دیتا...... بات بالکل واضح ہے۔

سبحان اللہ! ایسا پاکیزہ معاشرہ کہاں سے لائیں......!!! نبی اکرم ﷺ کے سامنے زناکاری کے جو بھی معاملات آئے، ان میں سے سبھی معترفینِ گناہ تھے جو سزا پانے کے لیے بھی بہ دل و جان آمادہ تھے اور اُنھی شادی شدہ معترفین گناہ کو رجم کیا گیا...... یہی سنتِ ثابتہ ہے کہ جو خود اعترافِ جرم کر کے خود کو سزا پانے پر آمادہ ظاہر کرے، اُسے رجم کر دینا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ جب ریاست لغویات سے پاک ماحول مہیا کرے۔ صحت، تعلیم، روزگار، رہائش اور خورد و نوش کی سہولتوں سے افرادِ معاشرہ کو خوش حال بنا دے۔ میڈیا کے سارے رکن فحاشی کے تمام راستوں سے مجتنب ہوں۔ حکمران عوام کی سطح پر رہ کر، عوام کے خادم بن کر اُن کی حکمرانی ہی نہیں دینی امامت کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہوں......تو کچھ عجب نہیں کہ اس سنتِ رسول ﷺ پر عمل کے مواقع بھی شاذ و نادر ملنا شروع ہو جائیں۔

ایسا کیوں نہیں ہو سکتا...... ملا عمر کے ایک حکم پر افغان مجاہد ہتھیار رکھ دیتا ہے اور دوسرے حکم پر اپنی افیون کی کاشت اور برداشت کو تلف کر دیتا ہے تو یہ مفروضہ بھی ناممکن العمل نہیں۔

اگر اسلامی ریاست مضبوط ہو، حکمران نیک نیّتی سے قوانین پر عمل درآمد کے قائل ہوں تو مروّجہ قوانینِ شہادت اور لیگل سسٹم کو درست کر کے مجرموں تک از خود پہنچ کر، ہر نوع کی سزا نافذ کر دینے کے امکانات ردّ نہیں کیے جا سکتے۔ بے رحمانہ انداز میں بے شمار معصوم افراد قتل کر دینے

Marfat.com

والے شخص کو سولی چڑھا دینا معاشرے کے لیے آج بھی قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔

تیسری وضاحت یہ مطلوب ہے کہ معاشرے میں ہونے والے جرائم کی اطلاع پا کر ان کا بخوبی تدارک بھی سنتِ رسول اللہ ﷺ ہے اور ایک یا دو شاذ روایات سے آپ ﷺ کے اصل طرزِ عمل کی ہرگز نفی نہیں ہوتی۔ کتبِ حدیث میں چند واقعات درج ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ:

1 یہودی اپنا معاملہ حضور ﷺ کے پاس لے کر آئے اور وہ معمولی سزا کا نفاذ چاہتے تھے۔ ان کی خواہش اور چالبازی کے باوجود آپ ﷺ نے رجم کی سزا پر عمل کروایا (بخاری)۔

2 زنا کا اعتراف کرنے والے شخص کو کوڑے لگوائے (مؤطا امام مالک)

3 باپ نے بیٹے کے جرم کا معاملہ سامنے رکھا۔ زانیہ عورت کے گھر کسی کو بھیج کر اُس کا پتہ کروایا اور پھر غیر شادی شدہ مرد کو کوڑے لگوائے جبکہ شادی شدہ عورت کو رجم کیا (مسلم)۔

4 ماعز بن مالک اسلمی کے شادی شدہ ہونے کی بنا پر اسے رجم کیا۔ (صحیحین)

5 غامدیہ عورت کو رجم کیا (ابوداؤد، مسلم)

6 ایک عورت کو لایا گیا پھر آپ ﷺ نے زانی مرد کا پتہ لگوایا اور اسے بھی سزا دی۔

چنانچہ نبی ﷺ کے دور جیسے پاکیزہ معاشرے میں جب اور جہاں بھی ایسا جرم ہوا، اس کی تحقیق کی گئی اور مناسب سزا دی گئی۔ جو مجرم از خود نہیں آیا یا اسے لایا نہیں گیا، اس کا بھی تعاقب کیا گیا، شناخت کی گئی، اس کے جرم کی پردہ پوشی نہیں کی گئی۔ رہ گئی بات اس حدیثِ مبارکہ کی جسے فقہا اپنے اس موقف کی تائید کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ جرم کی پردہ پوشی ہونی چاہیے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"مَن سَتَرَ مومناً فی الدّنیا علی عورة ستره الله یوم القیامة"۔

"جس شخص نے کسی مومن کے کسی عیب کی دنیا میں پردہ پوشی کی، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی پردہ پوشی کرے گا"

اس حدیث میں لفظ عَوْرَة آیا ہے جس کے معنی جسمانی نقص، بری عادت اور لائق شرم بات کے ہیں...... ان معانی کو زنا (اور وہ بھی زنا بالجبر اور زنا کی روزمرّہ عادت) جیسے قبیح فعلِ عمد پر کیسے چسپاں کیا جا سکتا ہے۔

ان صفحات میں متفرق جرائم اور ان کے لیے شرعی سزاؤں کا تفصیلی بیان سامنے آیا ہے۔

Marfat.com

ہم اس تفصیل کے ذریعے اصلاحِ احوالِ اُمت کے لیے ایک اور طرح کا استفادہ بھی قارئین کے گوش گزار کر رہے ہیں۔ نبیِ اکرم ﷺ اور صحابہ کے ادوار کو سامنے رکھیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ شرع کی رُو سے جن جن سزاؤں کا نفاذ ہوا (یا جو مطلوب ہیں) وہ درج ذیل ہیں:

1- رجم 2- قتل 3- کوڑے لگانا

4- سولی چڑھانا 5- قطعِ ید 6- مخالف سمت کے ہاتھ اور پاؤں کاٹنا

7- شہر یا ملک بدر کرنا 8- جرمانہ یا دیت 9- ضرورت مندوں کو کھانا کھلانا

0- غلام آزاد کرنا (یا فی زمانہ مقروض کا قرض ادا کرنا) !- روزے رکھنا

اس ساری فہرست میں ''جیل خانہ'' کہیں نظر نہیں آتا۔ یوں بھی جیل خانہ جات مجرموں کی سرپرستی کے ادارے ہیں۔ ہمیں کبھی بھی ان جیل خانہ جات سے اصلاحِ احوال کی صورت دکھائی نہیں دی۔

دوسری جانب دیکھیں تو احکام قرآنی واضح ہیں جبکہ فقہی موشگافیوں کی طرح وکیلانہ ہتھکنڈے بھی معاملات کو اُلجھاتے ہی ہیں۔ قرآن نے جھوٹی گواہی کو کبیرہ گناہ شمار کیا ہے اور وُکیل کا پیشہ اِلّا ماشاء اللہ اسی جھوٹ اور مکر و فریب پر قائم ہے۔ ''شہادت'' کے مروّجہ پُر پیچ راستے سے انصاف کو بعید تر کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ:

الف- حصولِ انصاف کے لیے وکیل کا کردار محض جج کی صحیح رہنمائی ہو سکتا ہے۔

ب- مقدمات کو طول دینے کے تمام حربوں کی راہیں مسدود ہونی چاہئیں۔

ج- مجرم محض چند روزہ حوالات میں اپنے انجام کو پہنچ جانا چاہیے۔

د- جیل خانہ جات کا مجرم سازی کا کارخانہ جتنی جلد بند ہو جائے بہتر ہے۔

ہ- خالی جیل خانہ جات میں پیشہ ور بھکاریوں کو آباد کیا جائے۔ ان میں سے ازکار رفتہ افراد کی فی سبیل اللہ حاجت روائی کی جائے۔ صحت مند عورت مرد کو جیل خانہ کی صنعت و حرفت کا کارآمد پرزہ بنا دیا جائے۔

قصہ مختصر، خود ساختہ اصطلاحات کے پسِ پردہ فرقہ داری کا پاکھنڈ چلانے والے فقہا کے لیے ایسے شرکیہ راستے سے نجات کی راہ وہی ہے جو ہم نے ان معروضات میں گوش گزار کر دی ہے۔

❁❁❁❁

Marfat.com

شہادتِ نفس

شہادت کے معروف معنی ہیں اعلانِ حق، اسی کو کہتے ہیں: ''گواہی''۔ جب قاضی یا حاکم کسی شخص سے کسی معاملے میں شہادت طلب کرتا ہے تو اس کا مطالبہ درحقیقت یہ ہوتا ہے کہ زیر نظر مقدمے یا معاملے میں جو کچھ قرینِ حق ہے، بلاکم وکاست بتا دیا جائے۔ بالعموم واقعاتی شہادت بھی فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے۔ قرآنِ حکیم میں ایسے ہی ایک مقدمے کا بیان موجود ہے جس میں گواہ (شاہد) چشم دید نہیں تھا۔ جب زلیخا نے سیّدنا یوسف علیہ السلام پر تہمت لگائی۔ پھر ایک سیانے آدمی نے واقعاتی شہادت کا راستہ دکھا دیا اور مقدمے کا فیصلہ ہو گیا۔ اس واقعہ کو قرآنِ حکیم نے شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ اَهْلِهَا (زلیخا کے اہل خانہ میں سے ایک شاہد نے شہادت دی) کے الفاظ سے رقم کیا ہے۔ عیاں ہے اس شاہد کا بیان کسی چشم دید واقعے پر مبنی نہ تھا۔

اُمتِ مسلمہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اہم ترین اجتماعی فریضہ یہ بیان کیا ہے کہ جس طرح نبیِ اکرم ﷺ شاہد (یعنی اعلان حق کرنے والے) بنا کر بھیجے گئے تھے اسی طرح مسلمان بھی دنیا کے سامنے شہادت حق کا فریضہ (یعنی اسلام۔ دین حق کو علی الاعلان پیش کرنے کا فریضہ) پوری جرأت مندی سے ادا کرتے رہیں۔ جو مومن اس فرض کی ادائیگی کے دوران میں قتل ہو جائے گویا اس نے شہادت حق کا یہ فریضہ اپنی جان دے کر انجام دیا۔ اسی لیے وہ ''شہید'' ہے یعنی اعلیٰ ترین انداز میں اعلان حق کرنے والا۔ اس کا شمار انبیا اور صدیقین کے ساتھ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے موصول ہونے والی ہدایت کو کاملاً انسانوں تک پہنچانے والے نبیِ کریم ﷺ کو ''شاہد'' کہا گیا ہے لیکن شاہد کے اس حقیقی معنی کی بجائے مسلمانوں میں اس غلط عقیدے کو فروغ دیا گیا کہ سیّدنا ونبیّنا محمد ﷺ ''اُمت کے احوال کے شاہد صادق ہیں''۔

شہادت کے معنی ہیں بیانِ حق، اعلانِ حق، اصرارِ حق۔ شہادتِ نفس کے معنی ہیں انسان کی

Marfat.com

اپنی ذات اپنی شخصیت کا اپنے آپ پر غور وفکر کے بعد اقرار و اعلان۔ ارشاد ہوا:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (53:41)

"عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفوس میں بھی"۔

انھی آیات الٰہی کو "شہادت انفس و آفاق" کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اہل تصوف نے "نفس" کی نت نئی تعبیرات کر کے اسے ایک عجوبہ بنا دیا ہے حالانکہ قرآنی اصطلاح میں نفس کے اصل معنی وہی ہیں جو سیّدنا علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائے ہیں:

"جان لو کہ نفس لغت کی رو سے کسی چیز کے وجود، اس کی حقیقت اور اس کی ذات کو کہتے ہیں۔" (کشف المحجوب، ص292)

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

ما من مولودٍ یولد علی الفطرة فابواه یهوّدانه او یمجّسانه او ینصّرانه۔

"ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت کے داعیوں اور تقاضوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا مجوسی یا عیسائی بنا دیتے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں توحید کو تسلیم کرنا، اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت (دین حق۔ دین اسلام کو معروف جاننا اور شیطانی وساوس اور منکرات کو باطل سمجھنا) ہدایت کی قبولیت کے یہ تمام تقاضے ودیعت کر دیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دین اسلام ہی دین فطرت ہے۔ پھر ارشاد ہوا:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (30:30)

"پس یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف جما دو، اس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا۔"

جو دین اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے منتخب کیا ہے، انسان کی فطرت بھی اسی کے مطابق بنائی گئی ہے۔ انسانوں کو علم و عقل اور ارادہ و اختیار کی صلاحیتیں دے کر اس امتحان گاہِ دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اسی پس منظر میں قرآنِ حکیم کے ذریعے بنی اسرائیل کو یہ باور کرایا گیا کہ جب

Marfat.com

تمھارے پاس انبیا آتے رہے تو ان کے ذریعے تاکید کی جاتی رہی کہ وہ آنے والے تمام مبشّرین و منذرین کی دعوت کو قبول کریں گے اور یہ بھی تاکید کی گئی کہ جب خاتم الانبیا ﷺ آئیں گے تو بنی اسرائیل ان کی دعوت پر بھی آمنّا و صدّقنا کہیں گے۔ انھی ہدایات کو میثاق النبیین کا نام دیا گیا ہے یعنی تمام آنے والے انبیا کو تسلیم کر لینے کا عہد۔

''اور جب اللہ نے (بنی اسرائیل سے) وہ میثاق (وہ عہد) لیا جو نبیوں کے ذریعے تھا کہ میں نے جو کچھ تمھیں کتاب اور حکمت میں سے عطا کیا ہے (اس کی پاسداری کرو گے) اور پھر جب تمھارے پاس وہ رسول ﷺ آئیں جو تمھارے پاس کی خبر (اللہ کی کتاب) کی تصدیق کریں تو تم ان پر ضرور ایمان لاؤ گے اور تم ضرور ان کی مدد کرو گے (اللہ تعالیٰ نے) کہا: کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس اقرار پر مجھے نگران مانتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم نے اقرار کیا۔ اللہ نے کہا پس تم (حق کی) گواہی دو (اعلان حق کرتے رہو) میں بھی (حق کے) اعلان میں (اس دعوت حق کی کامیابی کی جدّوجہد میں) تمھارے ساتھ ہوں۔'' (سورۂ آل عمران:81)

اس طرح کے میثاق (عہد) کا ذکر قرآن پاک میں بار بار کیا گیا ہے۔ کہیں اسے میثاق بنی اسرائیل کہا گیا ہے (2:83-5:70) اور کہیں اسے میثاق الکتاب کہا ہے (3:187-7:169) اور کہیں فرمایا کہ ہم نے ان سے میثاقاً غلیظاً لیا (4:21-4:154)۔ سورۂ الاعراف میں اس میثاق الکتاب کا ذکر ہے:

اَلَمۡ يُؤۡخَذۡ عَلَيۡهِمۡ مِّيۡثَاقُ الۡكِتٰبِ اَنۡ لَّا يَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَـقَّ

(169:7)

''کیا ہم نے ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا تھا کہ وہ اللہ کے بارے میں سوائے حق کے اور کچھ نہیں کہیں گے''۔

اِن تمام آیات مبارکہ میں جس امر کا تذکرہ ہے اسے بڑے ہی واضح الفاظ میں میثاق (عہد) کہا گیا ہے۔

❁❁❁❁

سورۂ الاعراف کی آیت 169 میں ایک عہد (میثاق الکتاب) کے تذکرے کے بعد اللہ

Marfat.com

تعالیٰ نے انسانوں کی فطرت میں ودیعت کردہ ایک مخصوص داعیے کا ذکر فرمایا ہے کہ جب بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد پیدا ہوتی ہے تو یہ فطری داعیہ بھی ساتھ لے کر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین حق کے تمام بنیادی تقاضوں کی قبولیت کے لیے انسان اور کائنات کے اندر انفس و آفاق کی جو آیاتِ بیّنات پیدا کی ہیں، ان پر غور وخوض ہر انسان کی فطرت کا داعیہ اور اس کا خاصہ ہے۔ اگر کسی گروہ انسانی کا براہِ راست رسولوں اور کتابوں سے سابقہ پیش نہیں آتا، تب بھی اس فطری داعیے کی موجودگی میں وہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ جب اس کا اپنا نفس (اس کی اپنی ذات) پکار پکار کر اسے اپنے خالق و مالک کی موجودگی کی خبر دے رہی ہے تو انسان پر لازم ہے کہ اپنے نفس کی پکار سنے اور حق کی تلاش میں نکل کھڑا ہو۔

بنی اسرائیل سے میثاق الکتاب کے تذکرے کے بعد ارشاد ہوا کہ یہ امر تمھاری کتاب ہدایت میں مذکور ہے اور تم میں سے جن لوگوں نے اس عہد کا پاس کیا ہم ان کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔ ساتھ ہی ایک اور واقعے کا ذکر فرمادیا جب بنی اسرائیل کو ایک بھیانک زلزلے سے خوفزدہ کر کے انھیں ایک بار پھر یہ تاکید کی گئی تھی کہ جو کچھ تمھیں بطور ہدایت دیا گیا ہے، اسے مضبوطی سے پکڑے رکھو اور اس دین حق کا اعلان عام بھی کرتے رہو۔ (خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ) اس مخصوص عہد (میثاق) کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی اس نعمت کا تذکرہ ضروری سمجھا جو بدی اور نیکی کی پہچان کی صورت انسان کی فطرت میں موجود ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ انسانوں کی تخلیق اور تسویے کے بعد ہم نے انھیں نیک و بد سے بھی آگاہ کیا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (91:7-8)

اور دیکھو کہ انسان کو ہم نے کس طرح بنایا اور سنوارا۔ پھر اس میں برائیوں اور بھلائیوں کی تمیز اور ان کا ادراک الہام کیا۔ کس طرح انسانوں کو اپنی ذات (اپنے نفس) پر فکر و تدبر کا راستہ دکھلایا۔ (وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ۔ الاعراف 172) غور کرو کہ کس طرح اللہ نے تمھیں پیدا کیا۔ تمھارے اندر کیسے کیسے نظام ہائے کار ترتیب دیے۔ کس طرح تمھیں علم و عقل اور فکر و تدبّر کی صلاحیتیں دیں۔ تمھیں جذبات اور محسوسات دیے۔ قلب اور ضمیر کی نعمتوں سے نوازا۔ ان تمام حقائق اور آیاتِ انفس کو انسانوں کے اپنے شعور پر مشہود اور منوّر کرتے ہوئے

Marfat.com

گویا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے پوچھ رہا ہے۔ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ۔ کیا ایسی احسنِ تقویم تخلیق بغیر کسی خالق و مالک کے پیدا ہوگئی ہے!

قبولیتِ حق کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم عطا کیا ہے اور رسولوں اور کتابوں کے ذریعے انسان کو نیک و بد دونوں راستے دکھا دیے ہیں۔ (وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ) پھر غور وفکر کرنے کی صلاحیت بخشی ہے۔ یہ مخصوص داعیہ اللہ کی جانب سے ایک انعام بھی ہے، بندوں کا امتحان بھی ہے اور ان پر اتمام حجت بھی! یہی بار امانت ہے جس کے لیے اانسانوں کو منتخب کیا گیا اور اسی امتحان میں پورا اترنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کھلی نشانیاں بھی دے رکھی ہیں:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ (53:41)

''ہم انھیں (انسانوں کو) عنقریب (بار بار اور پورے تسلسل کے ساتھ) آفاق میں اور ان کے اپنے نفوس (اپنی ذات) میں اپنی آیات دکھائیں گے (دکھاتے رہیں گے) یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ وہ (قرآن۔ اللہ کی بات) ہی حق ہے۔''

ہر انسان فطرۃً یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے (اگر ڈھٹائی سے کام نہ لے) کہ اس کا پیدا کرنے والا یقینا موجود ہے، اور فقط وہی ایک الٰہِ واحد (مختارِ کل) ہونے کا سزاوار ہے لیکن انسان کی اپنے معاشرے، اپنے ماحول اور اپنے ماضی سے گہری وابستگی اس کی حمیّتِ جاہلیہ بن کر اُبھر آتی ہے۔ یہ جاہلی عصبیّت اسے انفس و آفاق کے بیّن حقائق تسلیم کرنے نہیں دیتی۔ وہ اپنی گمراہی میں پڑ کر اصلی اور حقیقی منبعِ علم (وحی الٰہی) پر اپنے آبا و اجداد کے ڈھکوسلوں کو فوقیت دینے لگ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِعراض عنِ الحق کی یہ کیفیت اپنی کتاب میں بنی اسرائیل اور دوسری اقوام کی مثالوں کے ذریعے بار بار واضح کی ہے۔ ان گمراہ اقوام نے اپنے انبیا کے اقوال کو مسخ کر کے اور اپنے اولیا کے نام پر گھڑی ہوئی روایات کو کتبِ سماوی کی طرح حجت تسلیم کر لیا۔ انھیں مثلہٗ معہٗ قرار دے کر انھی پر ایمان لے آئے حتیٰ کہ صریح گمراہی اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی پیش کی ہوئی ان مثالوں میں اُمتِ مسلمہ کے لیے بھی مقامِ عبرت ہے، نصیحت بھی ہے اور وعید بھی۔

❁❁❁❁

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ الاعراف کی آیت 172 میں یہ واضح کیا ہے کہ انسان اپنے

Marfat.com

سرکشی میں اپنے معبودِ حقیقی کو بھول جاتا ہے تاہم اس کے اپنے نفس کی شہادت ہمہ وقت اس کے پیشِ نظر رہتی ہے۔ بنی آدم کی پشتوں سے ظاہر نے والے ہر فرد بشر سے اس کا اپنا نفس، اپنے ربّ کو تسلیم کرنے کا تقاضا کرتا رہتا ہے۔ اَلَسْتُ بِرَبِّکُم کا یہ سوال ہمہ وقت اس کے سامنے رہتا ہے اور وہ اپنی سرکشی میں راہِ ہدایت قبول کرے یا نہ کرے، انسان کا قلب اسے اس خالق و مالک کی موجودگی کے اقرار پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى (172:7)

''اور جب تمھارا ربّ بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد نکالتا ہے اور انھیں ان کی اپنی جانوں پر گواہ ٹھہراتا ہے۔ کیا میں تمھارا ربّ نہیں ہوں تو وہ کہتے ہیں (ان کے اپنے نفوس یہ اقرارِ حق اور اعلانِ حق کرتے ہیں) کیوں نہیں۔''

ضروری نہیں ہے کہ وَاِذْ کے بعد جو بات کی جائے وہ بس ایک ہی واقعے کا بیان ہو۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ بار بار وہ واقعہ پیش آیا اور اسی انداز میں۔

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ (124-123:37)

''اور الیاس رسولوں میں سے تھے جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ڈرتے نہیں ہو۔''

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ (16:29)

''اور ابراہیم جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو۔''

عیاں ہے کہ ان رسولوں نے اپنی قوم کو بار بار توحید کی دعوت دی اور انھیں اللہ کی بندگی کی طرف بلایا۔ ایک اور مثال میثاق النبیین کی ہے جو ہر نبی کی آمد پر الگ الگ لیا گیا لیکن وَاِذْ کے بعد ہی مذکور ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (7:33)

Marfat.com

''اور جب ہم نے نبیوں سے عہد لیا اور آپ ﷺ سے اور نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام سے اور ہم نے ان سے سخت عہد لیا۔''

مسجد الحرام کو ہمیشہ کے لیے ہر زمانے کے لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ کوئی خاص وقت پر پیش آنے والا اکلوتا واقعہ نہیں ہے تاہم اس کا ذکر بھی وَاِذْ کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (125:2)

''اور جب ہم نے کعبہ کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ ابراہیم کے مقام عبادت (کعبہ، مسجد الحرام) کو مستقل جائے نماز بنا لو۔''

✿✿✿✿

ان صفحات میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ سورۂ اعراف کی آیت 172 میں اللہ تعالیٰ نے اس شہادتِ نفس کا تذکرہ فرمایا ہے جو ہر انسان کی ذات میں ودیعت کردہ ایک فطری داعیے کے تقاضے کی صورت میں ہر انسان اپنے آپ سے ہمہ وقت لے رہا ہے لیکن مفسرینِ کرام نے بعض روایات کے حوالے سے اس شہادتِ نفس کو ازخود ''عہدِ الست'' کا نام دے دیا ہے۔

مفسرینِ یہ کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق سے بہت پہلے تا قیامت پیدا ہونے والے تمام انسانوں کی ارواح ایک ہی جگہ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃٌ (آپس میں گتھے ہوئے لشکر) کی صورت میں موجود تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم کا پتلا بنایا۔ اس کی پشت پر ہاتھ پھیر کر ارواح کی اس کثیر تعداد کو آدم کی پشت سے گزارا پھر ان سے ایک ''عہد'' یک بارگی لیا گیا کہ وہ اللہ ہی کو اپنا ربّ قرار دیں گے اور اس لشکرِ ارواح نے بہ یک زبان اقرار کر لیا۔

ان روایات کی رو سے اس معاملے کو ایک ہی بار پیش آنے والا واقعہ اور ایک عہد قرار دیا گیا ہے۔ ان مفسرین کا گمان ہے کہ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (ہم نے انسان کے اندر نیکی کا اور بدی کا شعور الہام کیا) کا الٰہیاتی دعویٰ نامکمل رہ جاتا اگر اللہ تعالیٰ اس طرح کا پریکٹیکل نہ

Marfat.com

کرتا۔ یہ باکمال مفسرین یہ وضاحت بھی از خود کرنے پر مجبور ہیں کہ اگرچہ ہم میں سے کسی انسان کو بھی یہ یاد نہیں کہ ایسا کوئی واقعہ ان کے ساتھ یا ان کی ارواح کے ساتھ پیش آیا تھا تاہم ان کے لاشعور میں ایک خواب کی سی کیفیت میں اس کی جھلک ضرور موجود رہتی ہے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ ایسی خواب وخیال باتوں کو جو وضعی احادیث پر مبنی ہوں اپنے فکر کا منبع بنانے کی بجائے اس آیتِ مبارکہ کی ایسی تعبیر کو قابل قبول مان لینا چاہیے جو زیادہ بہتر طور پر قرآن پاک کے بتائے ہوئے انفس وآفاق کے دلائل کی روشنی میں بخوبی کی جاسکتی ہے۔ یہ جان لینا چاہیے کہ نیکی اور بدی کا شعور اور ذاتِ حق کی پہچان ہمارے لاشعور میں اس الہام کے باعث ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے خود دعویٰ کیا ہے۔

یہ فرق بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ جہاں کسی ''عہد'' کا ذکر ہے اسے قرآنِ پاک نے عہد اور میثاق کہا ہے اور جس معاملے کو اللہ تعالیٰ نے از خود عہد یا میثاق کا نام نہیں دیا۔ اسے خود ساختہ عہدِ الست کا نام دینا کیسے درست ہوسکتا ہے۔ قرآن نے خود اس معاملے کو شہادتِ نفس کہا ہے اور اس کا تعلق آیاتِ انفس سے ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ انسان کی فطرتِ سلیم اسے اپنے الہِ واحد کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے۔ پھر فرمایا شھدنا ہم نے حق تم پر واضح کردیا ہے۔

شَهِدْنَا ۚ أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ (172:7)

''ہم نے حق واضح کردیا ہے کہ (اور تمھاری فطرت کو قبولیتِ حق پر استوار کردیا ہے) تاکہ تم قیامت کے روز ہمارے سامنے یہ معذرت پیش نہ کرسکو کہ ہمیں تو اے اللہ تعالیٰ تیرے ربّ ہونے کی خبر ہی نہ تھی۔''

اگر انسان صرف اپنی ذات، اپنی شخصیت یا اپنے نفس پر ہی غور کرلے تو اسے اپنے بنانے والے کی جانب مکمل رہنمائی مل جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس انتظام کو (وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ کو) اپنی جانب سے توضیحِ حق قرار دیا ہے یعنی شَهِدْنَا۔ اس کی بجائے اگر شَهِدْنَا کے معنی یہ لیے جائیں (جیسا کہ مفسرین نے لیے ہیں) کہ ''ہم انسانوں نے گواہی دی۔'' تو بات بالکل الٹ جاتی ہے۔ حالانکہ یہ اقرارِ حق ''قَالُوا بَلَىٰ'' کے الفاظ میں پہلے ہی مذکور ہے۔ اگر شَهِدْنَا کے لفظ کو اس کے بعد کہی جانے والی بات سے نہ جوڑا جائے تو ''أَنْ تَقُولُوا'' (کہیں تم یہ نہ کہو) کے الفاظ کا کوئی سرا نہیں ملتا۔

Marfat.com

جب بھی کوئی انسان اپنی ذات پر غور وفکر کرتا ہے تو وہ اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ کسی قادرِ مطلق کا انتظام ہے اور اس کے ضمیر کی آواز اسے اس مختارِ کل کی عبودیت کی طرف مائل کر لیتی ہے۔ اللہ الحق اور دینِ حق کی جانب یہ رغبت گویا زبانِ حال سے اقرارِ حق ہے۔

❁❁❁❁

ہمیں اُن روایات کی قبولیت میں بوجوہ تردّد محسوس ہوتا ہے جن میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کی پشت سے ارواح نکال کر ان سے ایک عہد لیا گیا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں:

> ''حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت سے ان کی اولاد اور ان سے ان کی اولاد نکالی۔ سب سے اقرار کرایا پھر پشت میں داخل کر دیا۔''

اس آیت کی تفسیر میں ابن احمد کی ایک روایت بہت معروف ہے۔ اس روایت میں کہا گیا ہے:

> جمعھم فجعلھم ارواحاً ثم صوّرھم
>
> ''اللہ نے انھیں جمع کیا پھر انھیں روحوں کی صورت بنایا پھر انھیں صورتیں عطا کیں۔''

اس کے بعد اس روایت میں ایسے الفاظ بھی آئے ہیں جو انسان کے مقصدِ تخلیق کی نفی کرتے ہیں:

> خلقت ھٰولاء للنّار وبعمل اھل النّار یعملون وخلقت ھٰولاء للجنّۃ وبعمل اھل الجنۃ یعملون
>
> ''یہ لوگ دوزخ کے لیے پیدا کیے گئے اور دوزخیوں جیسے کام کریں گے اور یہ لوگ جنت کے لیے پیدا کیے گئے اور جنتیوں جیسے کام کریں گے۔''

اس طرح اس روایت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ''عہدِ الست'' کے موقع پر ہی انسانوں کے دو گروہ بنا دیے گئے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ نقطۂ نظر قرآن سے متصادم نہیں ایک آیۂ قرآنی پیش کی جاتی ہے:

> وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ (179:7)

قرآنِ حکیم کی اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر بیان کرتے ہوئے مفسرین کرام ذرأنا کے معنی

Marfat.com

''پیدا کرنا'' لے لیتے ہیں اور اس طرح اس آیت کا ترجمہ (ان کے حسب منشا) یہ ہو جاتا ہے:

''اور بے شک ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیے ہیں بہت سے جن وانس۔''

حالانکہ عربی زبان میں ذرأنا کے معنی خلقنا نہیں ہیں۔ اس کے معنی ہیں ''ہم نے پھیلا دیے'' (اس کے بعد بہت سے جنّ وانس شیطان کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں) سورۂ النحل میں فرمایا:

وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ (13:16)

''اور زمین میں جو چیزیں تمھارے لیے گونا گوں قسموں کی پھیلائیں۔''

(امین احسن اصلاحی)

علامہ شوکانی نے تفسیر فتح القدیر میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے متعدّد روایات اور تعبیرات نقل کی ہیں۔

''مفسرین کی ایک جماعت کہتی ہے وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ کا معنی ہے کہ انھیں تخلیق کر کے ان پر یہ دلیل قائم کر دی کہ وہ ان کا خالق ہے چنانچہ یہ دلیل ہی مقام شہادت ہے۔''

مفسرین کی اس رائے میں ارواح کے نکالنے اور عہد لینے کا ذکر نہیں تاہم باقی تمام روایات اسی طرح کی ہیں جو شوکانی نے نقل کی ہیں۔

''اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ نے ارواح کو نکالا، اجساد کی تخلیق سے پہلے اور ان ارواح میں اللہ نے اپنے خطاب میں جو چاہا اس کی معرفت ڈال دی اور کہا گیا ہے کہ اس جگہ بنی آدم سے مراد ہے آدم کی ذات اور اس کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ جب اللہ سبحانہ نے آدم کو پیدا کیا تو اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس میں سے اس کی اولاد نکالی اور ان سے عہد لیا۔''

علامہ شوکانی کا یہ سارا بیان بغیر اسناد کے ہے اور ان میں بہت سے اختلاف واضح ہیں۔ اس کے بعد شوکانی کا بیان ہے:

''مؤطاّ، مسند احمد، تاریخِ بخاری، ابو دائود، ترمذی، نسائی، ابن جریر، ابن الهند، ابی حاتم، ابن جهان، ابو الشیخ، حاکم بن مردویه، بیہقی وغیرہم میں لکھا ہے کہ عمر بن الخطاب سے اس آیت کے بارے میں پوچھا

Marfat.com

گیا تو انھوں نے کہا میں نے سنا ہے کہ حضور ﷺ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم کو خلق کیا پھر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا پھر اس سے اس کی اولاد نکالی اور کہا کہ یہ گروہ جنت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور جنتیوں جیسے کام کریں گے۔ پھر پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور اس کی اولاد نکالی اور کہا یہ گروہ جہنّم کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور جہنّمیوں جیسے کام کریں گے۔ ایک شخص نے کہا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ! پھر عمل کی کیا اہمیت ہوئی! آپ ﷺ نے کہا جب اللہ کسی کو جنت کے لیے خلق کرتا ہے تو اس سے اہلِ جنت کے سے اعمال کرواتا ہے یہاں تک کہ وہ مرجاتا ہے اس حالت میں کہ وہ اہلِ جنت کے سے اعمال کررہا ہوتا ہے پھر اللہ اسے جنت میں داخل کرلیتا ہے۔ اور اللہ کسی کو جہنّم کے لیے خلق کرتا ہے تو اس سے اہلِ جہنّم جیسے کام کرواتا ہے یہاں تک کہ وہ مرجاتا ہے اس حالت میں کہ وہ اہلِ جہنّم کے سے اعمال کررہا ہوتا ہے پھر اللہ اسے جہنّم میں داخل کردیتا ہے۔''

یہ روایت جسے حضرت عمر ؓ سے منسوب کیا گیا ہے مجہول ہے۔ اس میں راوی اور سوال کرنے والے کے نام تک نہیں ہیں اور جو وضاحت نبیِ اکرم ﷺ سے منسوب کی جارہی ہے، صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی اور کی بنائی ہوئی عبارت ہے۔ یہ ساری بات اللہ تعالیٰ کے اس پروگرام کی نفی ہے جس میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ انسان اپنے ارادہ و اختیار سے نیکی اور بدی کا انتخاب کرے گا اور مکلّف ٹھہرایا جائے گا۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَھُوَالْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ (2:67)

''وہ ذات پاک جس نے (تمھاری) موت اور زندگی (کا یہ سلسلہ) بنایا تاکہ تم اس آزمائش میں ڈالے جاؤ کہ کون اچھے عمل کرتا ہے۔''

پھر یومِ حساب ہوگا اور فرمایا جائے گا:

اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ (17:40)

''آج کے دن ہر شخص کو اسی کی جزا ملے گی جو اس نے کمایا ہے۔''

Marfat.com

اس طرح ''عہدِ الست'' کا نقطۂِ نظر سامنے لانے والی روایات کے مندرجات نہ تو آپس میں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں نہ ہی قرآنی نقطۂِ نظر سے ہم آہنگ ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان روایات میں جس طرح قرآنی الفاظ کے معانی بیان کیے گئے ہیں لُغتِ قرآن سے ان معانی کی کوئی مطابقت نہیں بنتی۔

ان روایات میں ذکر ہے'' آدم'' کا جبکہ قرآن بنی آدم کا ذکر کرتا ہے۔ ان روایات میں کہا جارہا ہے کہ'' ارواح'' کو اکٹھا کیا گیا جبکہ قرآن کی آیت یہ بتارہی ہے کہ یہ معاملہ بنی آدم کی پشتوں سے ظاہر ہونے والی ان کی اولاد کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اس آیت میں کسی عہد یا میثاق کا ذکر نہیں بلکہ شہادتِ نفس کا تذکرہ ہے۔ مفسرین کرام نے یہ نامناسب رویہ اپنا رکھا ہے کہ وہ جہاں چاہتے ہیں نفس کے معنی روح کر لیتے ہیں۔ گویا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ معاذ اللہ، اللہ تبارک وتعالیٰ کو اپنا مافی الضمیر پیش کرنے کے لیے مناسب الفاظ نہیں ملتے۔ کہنا ہوتا ہے ارواح کہہ دیتا ہے نفوس! عربی زبان وادب کے کسی قاعدے قانون کے تحت بنی آدم کا معنی آدم، بنی آدم کی پشتوں کا مطلب آدم کی پیٹھ، شہادت کا معانی عہد، نفس کا معنی روح اور ذریت بنی آدم کا معنی ارواح نہیں ہوسکتا۔

❁❁❁❁

سبھی مفسرین کرام نے ''عہدِ الست'' کے موقع پر ارواح کے پیدا ہونے اور انھیں صورتیں عطا کیے جانے کے تخیلاتی نقطۂِ نظر کو قبول کرلیا ہے۔ اسی طرح سبھی مفسرین کرام دنیا میں آکر مرنے کے بعد یومِ قیامت سے پہلے تمام مرنے والوں کے لیے کسی تخیلاتی برزخی زندگی کے بھی قائل ہیں۔ اس طرح یہ باوقار علماءِ کرام انسانوں کے لیے بالفعل چار دفعہ حالتِ موت اور چار دفعہ زندگی کی حالت میں آنے کے قائل ہیں۔ پہلی بار مردہ حالت میں تھے، عہدِ الست کے لیے پہلی بار زندگی بخشی گئی پھر موت کی حالت میں رکھا گیا اور ماؤں کے بطون سے پیدا کر کے دوسری زندگی دی گئی۔ پھر طبعی موت مرنے کے بعد تیسری بار زندہ کر کے عالمِ برزخ میں رکھا گیا پھر قربِ قیامت موت دے کر چوتھی بار حساب کتاب کے لیے زندہ کیا جائے گا حالانکہ قرآن پاک نے بالکل واضح انداز میں انسانوں کے لیے دو دفعہ موت اور دو بار زندگی کا ذکر کیا ہے:

قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا

Marfat.com

فَهَلۡ اِلٰی خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِيۡلٍ (11:40)

"وہ کہیں گے اے ہمارے ربّ تو نے ہمیں دو بار موت کی حالت دی اور دو بار زندگی بخشی تو کیا اب اس عذاب جہنّم سے چھٹکارا پانے کی کوئی راہ ممکن ہے۔"

اس سارے قصہ کہانی میں اصل فساد فلاسفہ کے متخیّلہ عالمِ امثال اور اعیانِ ثانیہ کے نظریے کو تسلیم کرنے سے ظاہر ہوا ہے۔ مسلمان علما نے بھی یہ تسلیم کرلیا کہ روح، انسانی جسد کے بغیر بھی ایک مکمل وجود رکھتی ہے۔ حالانکہ قرآنِ حکیم کی کسی ایک آیت سے بھی یہ فلسفیانہ اور متصوّفانہ نظریہ ثابت نہیں ہوتا۔ نہ کسی عالم ارواح کی خبر ملتی ہے نہ کسی عالم برزخ کا پتہ چلتا ہے۔ برزخ محض ایک وقفہ ہے۔ مرنے سے لے کر دوبارہ اٹھائے جانے تک کا۔ قرآنِ حکیم سے بس اسی امر کے شواہد ملتے ہیں۔

ممکن ہے اس اعتراض کا یہ جواب دینے کی کوشش کی جائے کہ اصل زندگیاں تو دو ہی ہیں جن کا قرآنی آیت میں ذکر ہوا ہے۔ رہی برزخی زندگی اور تخلیق آدم سے پہلے کی زندگی تو یہ اور ہی نوعیت کی زندگیاں ہیں۔ یہ وضاحت درست نہیں۔ روایات میں تخلیقِ آدم سے پہلے کی زندگی کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ ارواح کو صورتیں دی گئیں۔ انھیں سمع و بصر اور گویائی عطا ہوئی، انھیں عقل و شعور سے نوازا گیا، ان سے عہد لیا گیا، اقرار کروایا گیا، انھیں مکلّف ٹھہرایا گیا۔ تو یہ سارا نقشہ ایک مکمل زندگی کا نقشہ ہے۔ اسی طرح یہ بتایا جاتا ہے کہ برزخی زندگی میں سب سے پہلے زندگی دے کر مردے کو اٹھا کر بٹھایا جاتا ہے، اس کو صورت دکھائی جاتی ہے، اس سے سوال و جواب کیے جاتے ہیں۔ اس کے جسد کو جنت دکھا کر اس کی فرحت سے شادکام کیا جاتا ہے، یا پھر جہنّم دکھا کر آگ کی لپیٹوں سے دہکایا جائے گا۔ قبر تنگ ہوگی، پسلیاں دوہری ہو جائیں گی۔ جسد کو کیڑے کھائیں گے، عذاب انسان کو محسوس ہوگا۔ صبح سے شام کرنا اور شام سے صبح کرنا مشکل ہو جائے گا۔ یہاں تک مذکور ہے کہ انبیا اپنی برزخی زندگی میں نماز پڑھ رہے ہوں گے۔ پھر بھلا ایسی زندگی کو مکمل زندگی کیوں نہ سمجھا جائے!

برزخی زندگی کے بارے میں مفسرین و محدثین کی مذکورہ تفصیلات ایک عجوبہ ہیں۔ اس لیے کہ قرآنِ حکیم میں صاف طور پر لکھا گیا ہے کہ جب قبروں سے مردے اٹھائے جائیں گے تو

Marfat.com

وہ اس اچانک افتاد سے گھبرا جائیں گے اور کہیں گے:

قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (52:36)

"وہ کہیں گے ہائے بربادی کس نے ہمیں ہماری خواب گاہوں سے اٹھا دیا۔"

جان نکلنے سے دوبارہ جی اٹھنے تک (وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ۔ جب انسانوں کا ویسا ہی جوڑا۔ ویسا ہی دوسرا انسان بنا دیا جائے گا) کسی مرنے والے نیک و بد انسان کو ہزارہا سال مردہ حالت میں رہنے کی کچھ خبر نہ ہو گی مگر انبیا، صدیقین اور شہداءِ اُمت (شہادت حق کا عظیم کام کرنے والے اور اس راہ میں جان تک دے دینے والے) مرتے ہی جنت میں داخل کر دیے جائیں گے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (12-10:56)

"(آخرت میں تین میں سے ایک گروہ) سب سے سبقت لے جانے والے سب سے پہلے جنت میں داخل کر دیے جانے والے، وہی مقربینِ بارگاہ الٰہی ہیں جو جنت کی نعمتوں میں ہیں۔"

یہ السابقون الاوّلون کہیں اور نہیں عند ربھم (اپنے ربّ کے پاس) ہوں گے۔ جنت کی فضاؤں میں!

❁❁❁❁

اللہ تعالیٰ نے یہ ارض و سما تخلیق کرنے کے بعد ہمیں بتا دیا کہ انھیں کس طرح اور کتنے عرصے میں بنایا، انھیں پانی سے تخلیق کیا گیا، وہ آپس میں گتھے ہوئے تھے پھر انھیں پھاڑ کر الگ کیا گیا۔ پھر آدم کی تخلیق ہوئی، کس کس طرح ہوئی، تمام مراحل بیان کر دیے گئے ہیں۔ ان باتوں کو بار بار مختلف پیرائے میں دہرایا گیا ہے۔ تاہم کسی ایک مقام پر بھی تخلیقِ ارواح کا ذکر نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم میں صرف نفخ روح کا تذکرہ ہے۔ انسان کو خلق کیا، اسے بنایا سنوارا (سَوّٰاہُ) پھر اس میں روح نفخ کی۔ بالکل ایسے ہی جیسے بتایا گیا کہ آسمانوں کو بنایا پھر اَوحیٰ فِی کُلِّ سمآءٍ اَمرھَا۔ ہر آسمان میں جو کچھ ہونا ہے، جو کمی بیشی جو نشوونمو، جو حرکت و ارتعاش ہو گی اور جو اس سے کام لیے جائیں گے یہ سبھی کچھ آسمان میں وحی کر دیا گیا۔ روح سے مراد بھی امرِ الٰہی ہے (خواہ امرِ تکوین ہو یا امرِ ہدایت) انسان کو بنا کر، سنوار کر، اس کی توانائیاں اور

Marfat.com

صلاحیتیں زندگی بھر کا پروگرام متعین کرنے والے قوانین، ہر انسان کی مختلف جہات۔ یہ سبھی کچھ ہر انسان میں الگ الگ داخل کر دیا جاتا ہے۔ یہی اس کی روح ہے۔ اگر مفسرین اپنی مرضی سے نفس کے معنی روح اور روح کے معنی نفس نہ کرنے لگ جائیں تو اوپر دیے گئے مطالب سے ماسوا کوئی اور معنی روح اور نفس کا قرآنی فکر سے برآمد نہیں کیا جاسکتا۔

انسانوں کی آمد سے پہلے جن کرۂ ارض پر موجود تھے۔ (وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ، 27:15) وہی کرۂ ارض کے حکمران تھے پھر انسان کو ان کا جانشین (خلیفہ) بنا دیا گیا۔ ملائکہ نے جب یہ کہا:

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (30:2)

''اے اللہ کیا تو زمین ایسی مخلوق بھیج رہا ہے جو اس میں فساد برپا کرے گی اور خون بہائے گی۔''

تو ملائکہ نے یہ بات اپنے سابقہ تجربے کی بنیاد پر کہی تھی۔ نیکی بدی کا تصور پہلے سے موجود تھا۔ جنوں کو گمراہ کرنے والا ابلیس پہلے سے موجود تھا۔ نوعِ جن قبیح حرکات میں مبتلا تھی اور اس شیطنت میں ابلیس ان کا سرغنہ تھا۔ اسے آدم کے معاملات میں دخل اندازی سے روکا گیا لیکن وہ اپنی سرشت کے مطابق خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا اس لیے کہ وہ کافروں میں سے تھا (اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ) قرآن پاک نے اسے ملائکہ میں سے یا مُعَلِّمُ الْمَلَكُوْت نہیں کہا۔

جان لینا چاہیے کہ لفظ ''کان'' ہمیشہ استمرار کے لیے آتا ہے۔ (تھا۔ رہا۔ ہے۔ رہے گا) كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہر شے پر قادر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہ طریقِ کار درست نہیں کہ کان کے جو معنی مفسرین کو اپنے لیے جس جگہ مفید مطلب نظر آئیں اسی طرح کے معنی ایجاد کر لیے جائیں۔

ابلیس نے چیلنج کیا کہ میں تیری راہ راست سے انسانوں کو بھٹکاتا رہوں گا تو جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ان میں سے جو تیری اتباع کریں گے میں ان سب سے جہنم کو بھر دوں گا (18:7) اگر عہدِ الست والی بات درست ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسی وقت کہہ دیتا کہ اے ابلیس فکر نہ کر میں نے تیرے حصے کے جہنمی پہلے سے ہی الگ سے پیدا کر رکھے ہیں۔ کشاکشِ حق و باطل بس ایک لفظی بات ہے نہ جدوجہد کی ضرورت ہے نہ جہاد کی، نہ تبلیغ کی کوئی اہمیت ہے نہ شہادتِ حق کی ذمہ داری کسی پر ڈالی جائے گی۔

Marfat.com

علامہ عبدالکریم اثری صاحب تفسیر عُروۃ الوثقیٰ نے نقل کیا ہے:

''جو لوگ صاحب نظر اور ارباب المعقولات ہیں، ان کا قول اس آیت کی تفسیر میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نکالا ذرّیت کو اور ذرّیت اولاد ہے جو اپنے باپوں کی پیٹھوں سے اس طرح نکلتی ہے کہ وہ نطفہ ہوتے ہیں پھر ان کو اللہ تعالیٰ نے نکال کر ماؤں کے پیٹ میں ڈال دیا۔ پھر ان کو علقہ کیا پھر مضغہ پھر ان کو ٹھیک انسان بنایا اور پوری تخلیق فرما دی پھر خود ان کو ان پر گواہ کیا، ان قوتوں سے جو اس نے ان میں ودیعت کیں، اپنی وحدانیت کی دلیلوں کی اور اپنی عجائب خلقت کی اور اپنی نادر صنعت کی۔ بس اس گواہ کرنے سے ان کی ایسی حالت ہوئی گویا کہ انھوں نے کہا کہ ہاں کیوں نہیں۔ گو کہ وہاں زبان سے یہ بات نہ کہی گئی ہو اور اس حال کو قال سے تعبیر کرنے کی بہت سی مثالیں قرآن کریم میں ہیں۔''

(تفسیر کبیر ج 3 ص 324)

یہ رائے انتہائی صائب ہے۔ تاہم آبا پرستی کے جنون میں مبتلا کتبِ حدیث کو مثلهٗ معهٗ قرار دینے والے، محض حدیثِ رسول اللہ ﷺ قرار دیے جانے کی رعایت کے بہانے ان درجنوں کتبِ حدیث کی ہزار ہا روایات کو وحیِ غیر متلو کہنے پر بضد علمائے کرام، اس صاف سادہ اور سچّی بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ ایسی روایات کو حدیثِ رسول ﷺ قرار دیتے ہیں جن میں قرآنی فکر سے اعراض اظہر من الشمس ہے۔ سورۃ الاعراف کی اسی آیت کے آخر میں اس روّیے کا ابطال بھی موجود ہے جسے یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ارشاد ہوا:

اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ (173:7)

''یا تم (معذرت خواہانہ) یہ نہ کہو کہ بلا شبہ ہمارے آبا نے شرک کیا اور ہم تو ان کے بعد آنے والی اولاد ہیں (اس لیے ہم ان کے پیچھے لگ کر ان کی راہ پر چل پڑے) اے اللہ کیا تو ہمیں اس جرم کی پاداش میں ہلاکت میں ڈال رہا ہے جو تجھے جھٹلانے والوں نے کیا''۔

اس عذرِ لنگ کا جواب اللہ تعالیٰ کی اسی بات میں پوشیدہ ہے کہ جب ہمہ وقت تمھاری اپنی

Marfat.com

ذات پکار پکار کر کسی خالق و مالک کی قدرتِ کاملہ کا، کسی عظیم ذات کے رزّاق، ربّ ہونے کا اعلان کر رہی ہے تو تم اپنے کفر کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس معذرت سے آبا پرستی کے جنون کا پردہ چاک ہو رہا ہے۔ کفر و طغیان کا یہ فساد آباء پرستی ہی کا شاخسانہ ہے۔ ہر شخص کو فکر و تدبّر کی صلاحیتیں دی گئی ہیں لیکن انسانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے اردگرد ارض و سما اور اپنے نفس پر غور کر کے خود اپنے لیے درست راہ عمل منتخب کرنے کی بجائے اپنی آزادی اور خود مختاری کو اپنی آبا پرستی کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

اب دیکھیے کہ جن روایات میں کسی مزعومہ عہدِ الست کا تذکرہ ہے، وہاں یہ تلقین کی جارہی ہے کہ اللہ ہی نیک و بد افراد منتخب کرتا ہے اور اللہ ہی ان سے نیک و بد افعال کرواتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ارادہ و اختیار کی جو امانت سپرد کی ہے اس کی کوئی وقعت نہیں۔ یہ سارا نقطۂ نظر خالصتاً جبر کا نقطۂ نظر ہے لیکن لائق صد افسوس ہے کہ یہ فکر کئی بڑے ناموں کے ساتھ وابستہ ہے لہٰذا ہماری آبا پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ اب اس فکر کو بغیر سوچے سمجھے قبول کر لیا جائے۔

اس طرح یہ ضروری ہو گیا کہ مستبد حکمرانوں کو اللہ کا فرستادہ، اللہ کا نائب، اللہ کا ظلّ قرار دے کر انھیں مقدس قرار دے دیا جائے۔ ان کے مظالم کو ہنسی خوشی برداشت کیا جائے۔ اپنی گئی گزری حالت کو جو فسق و فجور میں مبتلا ہو جانے کے باعث کفر و طغیان کے مناظر پیش کر رہی ہے، منشاء الٰہی جان کر اسے بدلنے کی کوشش نہ کی جائے۔ راضی بہ رضائے الٰہی رہ کر کفر و شرک کے مناظر کو برداشت کیا جائے اور اپنے آپ کو، اپنے ماحول کو بدلنے کی ''سعیِ باطل'' میں مبتلا نہ ہوا جائے۔ یہ جان لو کہ جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے اور اللہ جو کرتا ہے درست کرتا ہے، تمھارے کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ دن رات بیٹھے کسی آنے والے مہدی و مسیح علیہ السلام کا انتظار کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے منتخب سعادت مند بندوں کو ان کی زیارت سے مشرّف کرے گا اور جنھیں اس نے پہلے ہی جہنّم کے لیے منتخب کر لیا ہے، ان بدبختوں کو کسی آنے والے مہدی و مسیح کا نام لیوا بھی نہ بننے دے گا۔ وغیر ذالک من الھفوات!!

❁❁❁❁

سورۃ الاعراف کی آیت 172 میں انسانوں کو جس حقیقتِ مطلقہ کے ادراک کی دعوت دی گئی ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ ربوبیت کو پیش فرمایا ہے ارشاد ہوا ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ''۔ آیت کا آغاز بھی وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ میں صفتِ ربوبیت کے اظہار سے ہو رہا ہے۔

Marfat.com

جیسا کہ مفسرین نے گمان کیا ہے، انسانوں کو محض وقتی طور پر پیدا کرتے ہی ان سے ربوبیت کے اعتراف کا عہد لینا، سو یہ بے معنی ہے۔ ربوبیت کے معنی تو زندگی بسر کرنے پر ہی آشکار ہو سکتے ہیں۔ جیسے ہی انسان کو اپنی ضروریاتِ زندگی کا احساس ہوتا ہے اور غیب سے اسے وسائلِ رزق ملنا شروع ہوتے ہیں، جب اس کی حاجات پوری ہونے لگتی ہیں تو ہر ہر قدم پر انسان کو یہ احساس ہوتا چلا جاتا ہے کہ اس کا پالنہار، اس کا مربّی، رزق رساں اور لوازماتِ حیات مہیّا کرنے والی کوئی عظیم ہستی ضرور موجود ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے "توحیدِ ربوبیت" کو ہر کافر و مشرک پر مشہود گردانا ہے۔ ہمیں امام سے یہ اختلاف ضرور ہے کہ ربوبیت کی پہچان یا اس کا اقرار بھی مشرکین کی جانب سے کسی بھی درجے میں توحید کا اعتراف نہیں ہے۔ اس لیے کہ نصِ قرآنی کے مطابق یہ کفار اربابًا من دون اللہ کے قائل ہونے کی وجہ سے ہی مشرک قرار پائے۔ توحید چیزے دیگر است۔ اسے توحید الوہیت اور توحید ربوبیت میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی صفت (اسم) سے کسی غیر اللہ کو متصف سمجھنا شرک ہے۔ ہاں البتہ امام کی یہ بات بالکل درست ہے کہ اللہ کی صفتِ ربوبیت کو غیر اللہ میں بھی تسلیم کرنے کے باوصف یہ مشرکین خوب اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ایک "ربُّ الارباب" ضرور موجود ہے۔

چنانچہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ جسے مفسرین نے خود ساختہ عہدِ الست کا نام دے رکھا ہے وہ تو دراصل شہادتِ نفس ہے۔ اسی شہادتِ نفس کا تذکرہ ایک اور انداز میں یوم حساب کے ایک منظر کی صورت میں قرآنِ حکیم میں اس طرح پیش کیا گیا ہے:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ (6:130-131)

"اے گروہِ جنّ و انس (بتاؤ) کیا تمھارے پاس ایسے رسول نہیں آئے جو تم میں سے ہی تھے۔ جو تمھیں میری آیات سناتے تھے اور تمھیں تمھارے (ایسے انجام کے) دن سے ڈراتے تھے (جنّ و انس اس کے

Marfat.com

جواب میں) کہیں گے۔ ہم نے اپنے نفوس (اپنے آپ پر) غور کر کے
اس حقیقت کو جان لیا تھا۔ (پر وہ ایمان نہیں لائے) اس لیے کہ دنیا کی
زندگی نے انھیں دھوکے میں ڈالے رکھا۔ پھر وہ اپنے آپ ہی اس بات
کا اعلان کریں گے کہ بلا شبہ وہ کافر ہی رہے۔ (ہم نے رسولوں اور
کتابوں کے ذریعے انذار کا یہ سلسلہ) اس لیے (جاری کیے رکھا) کہ تیرا
ربّ کسی بستی کو اس طرح ناروا ہلاک کرنے والا نہیں درانحالیکہ وہ غفلت
میں ہوں (ان تک کتابوں اور رسولوں کے ذریعے پیغام حق نہ پہنچا ہو۔)''

ان آیاتِ قرآنی میں توحید کا انکار کرنے والوں پر عذابِ دنیا اور عذابِ آخرت دونوں کو رسولوں اور آیاتِ الٰہی سے جن میں کتابیں بھی شامل ہیں، منسلک دکھایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ انسانوں کی جانب سے غفلت میں ہونے کی معذرت اسی وقت قابل قبول ہوسکتی ہے جب ان تک رسول نہ آئے ہوں یا آیاتِ الٰہی نہ دکھائی گئی ہوں۔ عیاں ہے کہ رسول آیاتِ کتاب بھی پڑھ کر سناتے ہیں اور انفس و آفاق کی آیاتِ الٰہی بھی گنوا گنوا کر اپنے مخاطبین کو توحید کی دعوت دیتے ہیں جیسے کہ قرآنِ حکیم میں تبشیر بھی ہے، انذار بھی، احکامات و قوانین بھی ہیں معاملاتِ باہمی بھی۔ اسی طرح اُممِ سابقہ کے احوال بھی ہیں اور آیاتِ انفس و آفاق کا بیان بھی۔ رسول اپنی اُمت کو یہ سبھی کتابِ آیات پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور انھیں اپنے آپ پر اور کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اپنے قانون کے مطابق ہر طرح کی آیات (آیاتِ کتاب ہوں یا آیاتِ انفس و آفاق) کو لوگوں پر مشہود کیے بغیر انھیں ہلاک کر دینا ناروا (ظلم) ہے اسی لیے ایک طرف تو رسولوں کا سلسلہ بند ہو جانے کے بعد اُمتِ مسلمہ پر شہادتِ حق کی ذمّہ داری عائد کر دی گئی ہے اور دوسری طرف شہادتِ انفس و آفاق کا معاملہ ہے کہ جیسے جیسے انسانی علم ترقی کر رہا ہے کائنات کے حقائق اور انسانی جسد میں دیے گئے نظام ہائے کار کی گرہیں اور کھلتی چلی جا رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانینِ فطرت اور نظام ہائے حیات انسانوں پر مزید واضح ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے ہونے کی ایسی ہی شہادتیں قرآنِ حکیم میں بار بار دہرائی ہیں۔ کسی ایک مقام پر بھی کسی ایسے عہد کا ذکر نہیں ہے جس کی بنیاد پر انسان کو ہدایت پہنچے بغیر اسے

Marfat.com

مسئول قرار دیا گیا ہو۔ آیاتِ کتاب کو رسول اور اس کی اُمت لوگوں کے سامنے دہراتی ہے۔ (یقصون) اور آیاتِ انفس و آفاق انسانی قلب و ذہن پر ہر وقت دہرائے جاتے ہیں۔ قدم قدم پر ایسے چھوٹے بڑے واقعات سے انسان کو سابقہ پیش آتا ہے کہ وہ اپنی ذات پر، اس کے بنانے والے اور اس کی نشوونمو کرنے والے پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے دنیا کی زندگی میں اسے جو وقتی اور ظاہری کشش ہے، دھوکے میں ڈالے رکھے اور انسان خود ہی غفلت میں پڑا رہے۔

سورۂ انعام کی آیت 131-130 میں آیات کے لیے ''تلاوت'' کا لفظ استعمال کرنے کی بجائے بالخصوص یقصّون کا لفظ آیا ہے۔ اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں آیات سے مراد فقط آیاتِ کتاب نہیں ہیں بلکہ ان الفاظ میں آیاتِ انفس و آفاق کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ یقصّون کے لفظ کی یہ وضاحت سورۂ الاعراف کی آیت 176 کے الفاظ سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے۔ آیت 172 میں اللہ تعالیٰ نے توحید کے لیے شہادتِ نفس کی دلیل پیش کی ہے اس کے بعد آیات 175-176 میں ایک تمثیل کے انداز میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کے سامنے اللہ تعالیٰ اپنی آیات رکھتا ہے۔ (آتینہ آیاتنا) لیکن وہ انھیں قبول نہیں کرتے، شیطان کی پیروی کرتے ہوئے بھٹک جاتے ہیں اور انسان ہے کہ وہ زمین اور اس کی آسائشوں کے دھوکے میں مبتلا ہو کر زمین سے چپکتے چلا جاتا ہے (اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ) اور اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کرتا ہے (وَاتَّبَعَ هَوَاهُ) ایسے اشخاص کی مثال انھی لوگوں کی سی ہے جو آیاتِ الٰہی کا انکار کرتے ہیں۔ پھر ارشاد ہوا کہ اے نبی ﷺ آپ یہ باتیں سناتے رہیں (فَاقْصُصِ الْقَصَصَ) آیاتِ الٰہی اور نفسِ انسانی کی یہ حرکات دکھاتے رہیں اور دوسری جانب مذکور ہوا ہے: مشرکین کا انکار، شہادتِ نفس کو قبول نہ کرنا بلکہ اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کرنا، یہی منکرین کا طریقہ ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ کو تاکید کی جا رہی ہے کہ آپ آیاتِ الٰہیہ، آیاتِ کتاب، آیاتِ انفس و آفاق انھیں سناتے رہیں۔ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ شاید کہ یہ لوگ کچھ غور و فکر کریں۔

Marfat.com

شفاعت کا قرآنی مفہوم

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں مؤمنین کی یہ صفات بیان کی ہیں کہ وہ صالح اعمال کرتے ہیں، اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا اہتمام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو نیکی کرنے اور برائی سے بچنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نیکی کا چلن کم سے کم اور برائی کا ظہور زیادہ سے زیادہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ کے بارے میں قرآنِ پاک نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ انھیں دنیا والوں کے لیے نذیر یعنی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور عذابِ آخرت سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا گیا ہے تاکہ لوگ منکرات کو چھوڑ کر معروف کو اپنا لیں۔ ہمارے علما نبیٔ کریم ﷺ کی اس سنت پر عمل ضرور کرتے ہیں تاہم ساتھ ہی ساتھ ان علماءِ اُمت نے چند ایسے عقائد و افکار بھی مسلمانوں کے ذہنوں میں راسخ کر دیے ہیں جو نیکی سے پہلوتہی کے محرّکات بن گئے ہیں اور ان کے باعث اکثر افرادِ اُمت نہایت دلیری کے ساتھ بدی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ عیاں ہے کہ علما اپنے ان افکار و تصورات کے لیے کسی حد تک قرآنِ پاک سے اور زیادہ تر مروّجہ احادیثِ رسول ﷺ سے استفادہ کرتے ہیں یعنی ان روایات سے جو اُن تک پہنچی ہیں، یہ دیکھے بغیر کہ کون سی بات قرآنِ پاک جیسی محکم کتاب کی روشنی میں کچھ مثبت وضاحتیں پیش کر رہی ہے اور کون سی روایت سے قرآنِ حکیم کے منشا کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہو رہی ہے۔

نیکی سے پہلوتہی کے یہ محرّکات درجِ ذیل ہیں:

1 وسیلہ:

عام عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کسی نہ کسی ''وسیلے'' کا حصول نہایت ضروری ہے اور یہ ''وسیلہ'' یہ بزرگ، یہ ولی، پیر یا شیخ جس شخص سے راضی ہو گیا، اس کی بخشش یقینی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے عبادت کی حد تک ان بزرگوں سے

Marfat.com

عقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے اور ان کے حضور نذرانے اور چڑھاوے پیش کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ''وسیلہ'' کے معنی ''واسطہ'' نہیں بلکہ اس کا معنی ہے ''قرب''۔ یہ لفظ قرآنِ حکیم میں دو جگہ آیا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (35:5)

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرتے رہو اور صرف اسی کے تقرّب کے طالب بنو اور اس کی راہ میں برابر سرگرمِ کار رہو تاکہ فلاح پاؤ''۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا (57:17)

جن کو یہ پکارتے ہیں (جیسے مسیح علیہ السلام اور عزیر علیہ السلام) وہ تو خود ہی اپنے ربّ کے قرب کی طلب میں سرگرم ہیں کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ قرب حاصل کرتا ہے اور وہ اپنے ربّ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تمھارے ربّ کا عذاب چیز ہی ڈرنے کی ہے''۔

یہ دونوں آیات صاف صاف ''وسیلہ'' کے صحیح مفہوم کو بیان کر رہی ہیں یعنی قرب حاصل کرنا اور اللہ کا قرب حاصل کرنا ہی مومن کی زندگی کا مقصودِ حقیقی ہے۔ اس لفظ میں کسی بھی طرح سے ''وساطت'' یا کسی کی مدد کے ذریعے تقرّب کا کوئی مفہوم شامل نہیں ہے۔

عربی لغت کے لحاظ سے بھی اس لفظ کے معانی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ: ''لاروس'' میں لکھا ہے القربیٰ۔ ''الرّائد'' کہتا ہے المنزلۃ، الدّرجۃ۔ المنجد میں ہے عمل عملاً تقرّب بہ الی اللہ تعالیٰ۔ ''القاموس المحیط'' کی رو سے المنزلۃ، الدّرجہ القربۃ۔ ''اقرب الموارد'' میں لکھا ہے: رغب وتقرّب المنزلہ، الدّرجہ۔ امام رازی لکھتے ہیں وہ عمل جو اللہ تک پہنچا دے اور سیوطی کہتے ہیں وہ اطاعت جو اللہ کا قرب دلا دے۔

2 ایصالِ ثواب:

اگر یہ معلوم ہو کہ کسی مسلمان سے اس کی زندگی میں بہت سے گناہ سرزد ہوئے ہیں یا یہ گمان ہو کہ اس شخص کے نیک اعمال کی فہرست نہایت مختصر ہے تو یہ کوئی زیادہ فکر کی بات نہیں۔

Marfat.com

ایسے شخص کے مرنے کے بعد قرآنِ پاک اور مختلف تسبیحات پڑھ پڑھ کر اور اس کے نام پر صدقات و خیرات کر کر کے اس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری کیا جا سکتا ہے۔ یہ عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ اسی جذبے کے تحت تیجا، دسواں، چالیسواں اور برسیاں منائی جاتی ہیں۔ جمعراتیں مرحوم کے نام پر صدقات و خیرات کے لیے وقف کر دی جاتی ہیں اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس طرح مرحوم کی نیکیوں، اس کے ثواب کے ذخیرے میں اضافہ ہو رہا ہے۔

قرآنِ حکیم کی تلاوت، ذکر اذکار اور انفاق فی سبیل اللہ بلاشبہ بڑی نیکیاں ہیں لیکن ایصالِ ثواب کا یہ عقیدہ محض خوش فہمی ہے۔ یوم الدّین، یومِ حساب کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے بالتفصیل اور بارہا بیان فرمایا ہے۔ اور واضح طور پر بتا دیا ہے کہ اس دن ہر شخص کے اپنے اعمال ہی اس کے کام آئیں گے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (286:2)

ہر ایک پائے گا اور بھرے گا جو کرے گا۔

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (51:14)

تاکہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔ بے شک اللہ بڑی جلدی حساب چکانے والا ہے"۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (38:74)

"ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گرو ہوگا"۔

اور یہ بات نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث شریف سے بھی واضح ہے کہ مرنے کے بعد صرف تین چیزیں انسان کے کام آئیں گی۔ ایک تو اس کے نیک اعمال جو اس نے اپنی زندگی میں خود کیے، دوسرے وہ صدقاتِ جاریہ جن کا اہتمام خود اس نے اپنی زندگی ہی میں کر دیا اور تیسرے اس شخص کی "صالح" اولاد کی جانب سے مرنے والے کے لیے دعائے مغفرت!

اب جن اُمور میں مرنے والے کی منشا شامل نہیں رہی، اس کے مرنے کے بعد ہونے والے ایسے تمام نیکی کے کام اس شخص کے کسی کام کے نہیں ۔ایصالِ ثواب کا اہتمام کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ ایصالِ ثواب کی حقیقت تو اللہ ہی کو معلوم ہے، خود ان کا کیا ہوا عمل مقبولِ بارگاہ الٰہی ہو رہا ہے یا نہیں!

Marfat.com

صرف ایک حدیث میں مذکور ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میری والدہ ایک کنواں کھدوانا چاہتی تھیں کہ اچانک فوت ہوگئیں۔ آیا میں ان کے نام پر یہ کنواں کھدوادوں کہ اس صدقۂ جاریہ کا ثواب انھیں پہنچتا رہے۔ حضور ﷺ نے اثبات میں جواب دیا۔ اس حدیثِ رسول ﷺ سے واضح ہے کہ مرنے والی کی نیت اس نیک کام کے کرنے کی تھی اور اسی کی چھوڑی ہوئی دولت سے یہ کام کردیا گیا چنانچہ یہ درست طور پر ''صدقۂ جاریہ'' ہوا نہ کہ ایصالِ ثواب کا اہتمام۔ جب اس روایت کی پوری طرح کھوج لگائی گئی تو معلوم ہوا کہ کنواں کھدوانے والا معاملہ بھی غلط ہے۔ اصل میں مرحومہ نے ایک نذر مانی ہوئی تھی جو اس کے بیٹے نے پوری کردی۔ سو یہ معاملہ یوں سمجھیں کہ قرض کی ادائی کا معاملہ تھا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: مسئلہ ایصالِ ثواب۔ ایوبی)

3 شفاعت:

محض کلمہ گو مسلمان اور نبیِ اکرم ﷺ کا نام لیوا بھی اگر زبانی کلامی ہی سہی اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرتا رہے تو روزِ حساب نبیِ اکرم ﷺ اس کے حق میں سفارش کر کے اسے اللہ کے عذاب کی گرفت سے نجات دلادیں گے۔

یہی تیسرا محرّک اس مقالے کا اصل موضوع ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے اسماالحسنیٰ میں ایک ایسے اسم کا بھی قرآنِ پاک میں بار بار ذکر کیا ہے جسے کفّار ومشرکین اپنے جھوٹے خداؤں کی شان ظاہر کرنے کے لیے بہ کثرت استعمال کرتے تھے۔ اللہ نے فرمایا:

وَذَكِّرْ بِهِ أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ (70:6)

''اور قرآن کے ذریعے سے نصیحت دو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی جان اپنے کیے پر پکڑی جائے۔ اللہ کے سوا کوئی اس کا حامی ہے اور نہ شفیع مددگار''۔

اَللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۖ مَا لَكُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ ۚ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ (4:32)

Marfat.com

''اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان کی چیزوں کو چھ دنوں میں پھر وہ عرش (اقتدارِ اعلیٰ) پر متمکن ہوا۔ اس کے سوا نہ تمھارے لیے کوئی کارساز ہے نہ شفیع مددگار۔۔ کیا تم لوگ نصیحت حاصل نہیں کرتے''۔

یعنی اللہ ہی ''ولی'' ہے اور اللہ ہی ''شفیع'' ہے، اللہ ہی ساتھی، مددگار، ناصر، کارساز، حاجت روا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ یہ مشرکین اللہ کے سوا اوروں کو بھی اپنا ''شفیع'' جانتے ہیں حالانکہ اللہ کے سوا اور کوئی شخص، کوئی جن وانس حقیقی معنوں میں ''شفیع'' یعنی مددگار نہیں ہوسکتا۔ فرمایا:

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (18:10)

''اور وہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو نہ تو نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے نزدیک ہمارے شفیع، ہماری مدد کرنے والے ہیں۔ کہہ دو: کیا تم ایسی بات کی خبر دیتے ہو جس کا اللہ کو خود پتہ نہیں، نہ آسمانوں میں نہ زمین میں۔ وہ پاک اور ارفع ہے ان چیزوں سے جن کو وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں''۔

مطلب یہ کہ نفع نقصان اور مدد، حاجت روائی کرنے والا صرف اللہ ہے۔ کوئی اور ''ولی'' ہوسکتا ہے نہ ''شفیع''۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی اپنی ذات کے علاوہ پوری کائنات میں کسی کے پاس ایسا اختیار اور تصرّف کا حق نہیں ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ○ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (39:43-44)

''کیا انھوں نے اللہ کے مقابل دوسروں کو شفیع مددگار اور حاجت روا سمجھ رکھا ہے۔ کہو! اگر چہ یہ نہ کچھ اختیار رکھتے ہوں نہ کچھ سمجھتے ہوں! کہہ دو کہ شفاعت حاجت روائی کا کل اختیار اللہ ہی کے پاس ہے۔ اس لیے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے''۔

Marfat.com

اللہ ہی شفیع ہے

''شفیع'' کا لفظ لایملکون شیئا اور لہٗ ملک السمٰوات والارض کے حوالے سے استعمال کیا گیا ہے۔ جس کا واضح مقصد یہی بیان کرنا ہے کہ اللہ کے سوا نہ کوئی صاحبِ اختیار و اقتدار ہے نہ اس کی طرح کوئی حاجت روا اور مشکل کشا!

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ۚ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (18:40)

''اور آپ انھیں قریب آ لگنے والی آفت کے دن سے ڈرائیں جب دل حلق میں آ پھنسیں گے اور وہ غم سے بے حال ہوئے ہوں گے۔ اس دن ظالموں کا نہ کوئی ہمدرد ہوگا اور نہ کوئی شفیع مددگار جس کی اطاعت کی جائے''۔

اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے دیگر آیاتِ قرآنی میں طرح طرح سے بیان کیا ہے:

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (51:6)

''اور آپ اسی قرآن کے ذریعے ان لوگوں کو جو اس بات کا ڈر رکھتے ہیں کہ اپنے ربّ کے حضور اکٹھے کیے جائیں گے، خبردار کریں کہ ان کا اللہ کے سوا کوئی حامی اور شفیع (مددگار) نہ ہوگا۔ تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں''۔

اس آیت میں ایک بار پھر یہی بات دہرائی گئی کہ صرف اللہ ہی ''شفیع'' ہے: اس کے علاوہ کوئی شفیع نہیں ہے۔

............وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا (94:6)

''اور ہم تمھارے ساتھ ان مددگاروں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے بارے میں تمھارا گمان تھا کہ وہ تمھارے معاملے میں ہمارے شریک ہیں (ہماری طرح شفیع و مددگار ہیں)''۔

يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ (53:7)

Marfat.com

''وہ لوگ جنھوں نے پہلے کتاب کو نظر انداز کر دیا تھا بول اٹھیں گے کہ بے شک ہمارے ربّ کے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے تھے۔ تو ہیں کوئی ہمارے مددگار شفیع جواب ہماری مدد کریں یا ہے کوئی صورت کہ ہم دوبارہ لوٹائے جائیں کہ اس سے مختلف عمل کریں کہ جو ہم پہلے کرتے رہے ہیں''

وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ۝ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ (26:99-101)

''اور ہم کو تو بس مجرموں نے گمراہ کیا۔ تو اب نہ ہمارا کوئی شفیع مددگار ہے نہ کوئی سرگرم دوست''۔

- وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ (30:12-13)

''اور جس دن قیامت واقع ہوگی تو مجرم اس دن مایوس ہو جائیں گے۔ اور ان کے بنائے ہوئے اللہ کے شریکوں میں سے ان کا کوئی شفیع مددگار نہ ہوگا۔ اور وہ مجرم ان شریکوں کو (حاجت روا) ماننے سے انکار کر دیں گے''۔

مشرکین کا عقیدہ

شفاعت بمعنی مدد کا دعویٰ، ہمارا تفرّد نہیں۔ علامہ احمد رضا خاں بریلوی کے ترجمہ قرآن (کنز الایمان) پر حاشیے میں نعیم مراد آبادی نے گویا ہماری رائے ہی کی ترجمانی کر ڈالی ہے، ہمارے ہی نقطۂ نظر کی یہ فصاحت چشم کشا ہے۔ سورۂ یٰسین آیت 18 میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا ایک دعویٰ نقل فرمایا ہے جس میں مذکور ہے کہ:

''یہ اولیا یہ بت، یہ اصنام اللہ تعالی کے ہاں ہمارے شفیع ہیں۔''

ان الفاظِ قرآنی کی توضیح میں نعیم مراد آبادی لکھتے ہیں:

''یعنی دُنیوی اُمور میں (مراد ہے کہ مددگار ہیں) کیونکہ آخرت اور مرنے کے بعد اُٹھنے کا تو وہ اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔''

اس طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ قران حکیم میں جہاں کہیں بھی مشرکین کا، اُن کے اصنام کے ان کے شفیع ہونے کا دعویٰ ہے (اور اس کی تردید اللہ تعالیٰ نے بار بار قرآن حکیم میں کی

Marfat.com

ہے) ان اولیا، بتوں اور اصنام کا شفیع ہونے کا دعویٰ ہرگز ہرگز بعث بعد الموت کے احوال سے متعلق نہیں ہے۔ چنانچہ ایسی تمام آیات میں شفیع کا معنی مددگار ہی ہوسکتا ہے (احوال دنیا میں مددگار) شفیع کا معنی سفارشی ہوسکنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔

صد افسوس کہ مشرکین کے دعویٰ (شفیع بمعنی مددگار) کے برعکس علمائے تفسیر وحدیث نے وضعی احادیث اور باطنی تفاسیر کے بل بوتے پر روزِ حساب (جس کا ذکر ان آیاتِ قرآنی میں شفیع ہونے کے حوالے سے آیا ہی نہیں) شفاعت (بمعنی سفارش) کا ایک ایسا عقیدہ قائم کرلیا ہے جس کے لیے قرآن حکیم سے کوئی ثبوت نہیں مل سکتا۔

علم اور اختیار

ان تمام آیاتِ مبارکہ میں ''شفیع'' کا لفظ اپنے اصل معانی یعنی معین ومددگار، حاجت روا اور کارساز کے لیے ہی استعمال ہوا ہے اور کم از کم ان آیات کی حد تک اس لفظ سے ''سفارش'' کا مفہوم نکالنا قرآنی اسلوب کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے خود اپنی ذات کو ''شفیع'' قرار دیا ہے اور جھوٹے الٰہوں اور معبودوں کو ''شفیع'' یعنی کارساز ماننے والوں کی تکذیب کی ہے۔
اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ایک عام قاعدے قانون کے طور پر یہ بات بھی بتلادی ہے کہ اللہ کے سوا کسی کا کارساز وحاجت روا، شفیع ومددگار ہونا قطعاً غیر حقیقی ہے اس لیے کہ خود اللہ کو جو عالم الغیب والشہادۃ ہے، اس بات کی قطعاً کوئی خبر نہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــــُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (255:2)

''اللہ ہی الٰہ ہے، اس کے سوا کوئی (الٰہ۔ مختارِ کُل) نہیں۔ وہ زندہ ہے، سب کا قائم رکھنے والا ہے۔ نہ اس کو اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے۔ کون ہے جو اس کے علم میں ہوتے ہوئے، اس کی دی ہوئی رخصت کے بغیر کسی کی (شفاعت) مدد

Marfat.com

کر سکے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے۔ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین میں سب پر حاوی ہے اور ان کی حفاظت اس پر ذرا بھی گراں نہیں ہے اور وہ بلند اور عظیم ہے"۔

اِلَّابِاِذْنِہٖ کا درست مفہوم یہی ہے کہ اللہ کے علم کے بغیر اور اس کی جانب سے رخصت کے بغیر کوئی کسی کا مددگار نہیں ہوسکتا اور درحقیقت ایسا ہے بھی نہیں۔ تمام آیاتِ شفاعت کی تحقیق سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ "شفیع" ہونے کا تعلق براہِ راست احاطۂ علم اور اختیار واقتدار سے ہے۔ اللہ ہی کو علم ہے کہ جھوٹے معبودوں کی اصلیت کیا ہے۔ جب ان جھوٹے خداؤں کو علم ہی نہیں ہوسکتا کہ کسی نے کیا عمل کیا تو مدد کی توقع کیسی! یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اللہ کو علم ہی نہ ہو اور دنیا میں ایسے صاحبِ کمال موجود ہوں جو مرنے کے بعد بھی ان افرادِ انسانی کے احوال سے واقف ہوں اور دنیا اور آخرت میں ان کی مدد کرنے کے بھی اہل ہوں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ متعدّد آیاتِ قرآنی میں اذن لہٗ الرّحمٰن یا اذن لہ کے الفاظ جہاں کہیں آئے ہیں وہاں اس مزعومہ ہستی کا ذکر ہی نہیں جسے شفیع (مددگار یا غلط معنوں میں سفارش کرنے والا) سمجھ لیا گیا ہے بلکہ ان آیات میں اذن لہ کے الفاظ کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو مدد کے طالب ہیں۔ اور جن آیات میں الاّ باذنہ کے الفاظ آئے ہیں وہاں طرزِ کلام استفہامیہ ہے یعنی کسی انسان یا جنّ و ملک کے "شفیع" ہونے کے امکان کا مکمل ردّ ہے (کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ کے علم میں ہی نہ ہو اور کوئی شفاعت کرنے والا موجود ہو!) چنانچہ ایک بات تو یہ طے ہوئی کہ اللہ ہی کو علم ہے کہ کسے معاف کرنا ہے اور کسے نہیں۔ اور دوسری طرف یہ بات غلط ثابت ہوگئی کہ کچھ شخصیات یا افراد ایسے ہوں گے جنھیں شفاعت بمعنی سفارش کی اجازت دے دی جائے گی۔ اور تیسری بات بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ ان تمام آیات میں کہیں بھی "اِذن" کا معنی "حکم" نہیں بلکہ اجازت اور رخصت ہے۔

استغفار

چند آیات میں اس طرح کے الفاظ آئے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرّب فرشتے قیامت کے روز ان لوگوں کے مددگار ہوں گے، جن کے بارے میں اللہ کی رضا

Marfat.com

(ان کی مغفرت کے بارے میں) ان کے شاملِ حال ہوگی۔ ان فرشتوں کا مددگار ہونا اللہ کے ''اذن'' سے ہوگا اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ وہ مومنین کے حق میں دعائے مغفرت کر رہے ہوں گے۔ ملائکہ، عیاں ہے کہ کارکنانِ قضا و قدر ہیں۔ ان کی جانب سے مدد کا معنی ہی یہ ہے کہ اللہ ان مومنین کی مدد کر رہا ہے، انھیں معاف کرنا چاہتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ (7:40)

''جو ملائکہ عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے اردگرد ہیں (جو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کے مدبّر ہیں) وہ اپنے ربّ کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اس کی حمد کے ساتھ اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں جو ایمان لائے۔ اے ہمارے ربّ تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز کا احاطہ کیا ہوئے ہے۔ تُو ان لوگوں کی مغفرت فرما جو توبہ کرکے تیرے راستے کی پیروی کرتے رہے اور ان کو عذابِ جہنّم سے بچا''۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى (26:53)

''اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی (شفاعت) مدد ذرا بھی کام آنے والی نہیں مگر اللہ کی دی ہوئی اجازت کے تحت، وہ جس کے بارے میں چاہے اور جس کے بارے میں پسند کرے''۔

اوپر دی گئی آیت 7:40 میں یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ ملائکہ ان لوگوں کے لیے دعائے مغفرت کریں گے۔ للذین تابوا واتبعوا سبیلک جو گناہوں سے توبہ کرکے اللہ کی راہ میں نیک اعمال کرتے ہوئے اس کے حضور حاضر ہوں گے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ

Marfat.com

وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ (29-26:21)

''اور وہ (مشرکین فرشتوں کے حوالے سے) کہتے ہیں کہ ملائکہ خدائے رحمان کی اولاد ہیں۔ وہ ان باتوں سے ارفع ہے۔ بلکہ وہ ملائکہ تو اللہ کے مقرب بندے ہیں۔ وہ اس کے حضور اس کے کاموں میں سبقت نہیں کرتے۔ اور اللہ کی مرضی کے مطابق ہی تمام کام کرتے ہیں۔ اللہ ان کے آگے اور ان کے پیچھے جو کچھ ہے، سب سے باخبر ہے۔ اور وہ ملائکہ کسی کی (شفاعت) مدد نہیں کریں گے مگر اس کی جس کی مدد کرنا اللہ پسند کرے اور وہ اللہ کی خشیت سے لرزاں رہتے ہیں اور ان میں سے جو بھی مدعی بنے گا کہ اللہ کے سوا میں بھی الٰہ (مختارِ کل، حاجت روا) ہوں تو ہم اس کو جہنم کی سزا دیں گے اور ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں''۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو ''شفیع'' ماننے کا معنی یہی ہے کہ اسے ''الٰہ'' مان لیا گیا ہے یعنی صاحبِ اقتدار و اختیارِ کلی! فرشتوں کی جانب سے ہی استغفار کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۭۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (38:78)

اس (قیامت و حساب کتاب کے) روز جبریلِ امین اور ان کے ساتھ ملائکہ صفیں باندھے کھڑے ہوں گے۔ صرف اس کے بارے میں بات کریں گے جس سے اللہ راضی ہوگا اور جو درست بات کہے۔

(درست بات کی وضاحت (7:40) میں ہو چکی ہے کہ توبہ کر کے اور نیک اعمال کر کے آنے والوں کے لیے ملائکہ استغفار کریں گے)۔

ہاں البتہ اللہ تعالیٰ کے حضور کسی کے لیے مغفرت کی دعا کرنا ہی کسی غیر اللہ کے بس میں

Marfat.com

ہے۔ تاہم ان آیاتِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے یہ اصل الاصول بھی بیان کر دیا کہ جس شخص کے لیے مغفرت طلب کی جارہی ہے وہ نہ صرف یہ کہ مومن ہو بلکہ اپنی خطاؤں اور ذنوب سے توبہ کر چکا ہو اور اللہ ہی کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہوا اس کے حضور پہنچے۔ فقط اسی صورت مغفرت کی دعا کو شرفِ قبولیت حاصل ہو سکتا ہے۔

شفاعتِ حسنہ

قرآنِ حکیم میں شفاعت کو شفاعتِ سیّئہ اور شفاعتِ حسنہ بھی کہا گیا ہے۔ بالعموم اس سے یہ مراد لیا جاتا ہے کہ جس نے اچھی ''سفارش'' کی اسے ثواب میں سے حصہ ملے گا اور جس نے بری سفارش کی اسے عذاب میں سے! حالانکہ اس مقام پر بھی شفیع کے معنی ناصر و مددگار ہی کے ہیں۔ جیسا کہ لغوی طور پر ظاہر ہے:

الشّفیع: من یزد عملاً الی عمل (جو کسی عمل میں کسی اور عمل کا اضافہ کرے)

الشّفاعۃ: الانضمام الا آخر، ناصر الیہ و سائلہ عنہ

عاونہ و قواہ و شارکہ فی نفعہ و ضرہ

اب متعلقہ آیت ملاحظہ کریں:

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا (85:4)

''جو کوئی کسی اچھے کام میں (بطور مددگار) شامل ہوگا اسے اس میں سے حصہ ملے گا اور جو کوئی کسی برے کام میں (بطور شفیع۔ مددگار) شریک ہوگا اسے اس میں سے حصہ ملے گا۔ اور اللہ ہر چیز کی طاقت رکھنے والا ہے''۔

اس آیت میں شفاعت مدد کے معنوں میں ہے اور اس بات کو سمجھنے کے لیے ماقبل کی آیت دیکھنا ضروری ہے:

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا (84:4)

''پس اللہ کی راہ میں جنگ کرو۔ تم پر اپنی جان کے سوا کسی کی ذمہ داری نہیں ہے اور مومنوں کو قتال کے لیے اُبھارو۔ توقع ہے کہ اللہ کافروں کے

Marfat.com

دباؤ کو روک دے اور اللہ بڑے زور والا اور عبرت انگیز سزا دینے والا ہے"۔

بتایا یہ جا رہا ہے کہ جو شخص قتال میں حصہ لے گا اسے ثواب ملے گا اور جو قتال سے پہلو تہی کرے گا اسے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ رہی بات قتال میں حصہ لینے کی "سفارش" کرنے کی تو اس کا ذکر ان آیات میں کہیں نہیں۔ بلکہ نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ حرض المؤمنین۔ چنانچہ یہاں بھی شفاعت حسنہ اور سیّئہ کہنے سننے سے (محض سفارش سے) متعلق نہیں بلکہ قتال میں عملی حصہ لینے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مدد کرنے سے متعلق ہے۔ یہ بات اس آیت کے پس منظر کو جان لینے سے اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ مولانا احمد رضا خان لکھتے ہیں:

> "بدرِ صغریٰ کی جنگ جو ابوسفیان سے ٹھہر چکی تھی، جب اس کا وقت آ گیا تو رسولِ اکرم ﷺ نے وہاں جانے کے لیے لوگوں کو دعوت دی۔ بعضوں پر یہ گراں ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اپنے حبیب ﷺ کو حکم دیا کہ وہ جہاد نہ چھوڑیں اگرچہ تنہا ہوں۔ اللہ آپ کا ناصر ہے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ یہ حکم پا کر رسولِ کریم ﷺ بدرِ صغریٰ کی جنگ کے لیے روانہ ہوئے۔ صرف ستر سوار ہمراہ تھے"۔ (225)

شفیع المذنبین

جن لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کے لیے "شفیع المذنبین" کا لقب ایجاد کر لیا ہے ان کے پیشِ نظر جو کچھ بھی ہو، اس کے مفہوم سے قطع نظر فی نفسہٖ یہ اصطلاح غور طلب ہے (یعنی گناہ گاروں کا ساتھی اور مددگار) جو لوگ، جو مؤمنینِ صالحین اپنی خطاؤں سے توبہ کر چکے ہوں، اپنے ذنوب سے برأت کا اظہار کر چکے ہوں اور ایک بار پھر ایک مومنِ صالح کی طرح زندگی گزارتے ہوئے ربّ کے حضور پیش ہوں (جیسا کہ آیۂ مبارکہ میں بتایا گیا) انھیں "مذنب" کہنا ہی نہیں چاہیے اور اللہ سے کرم و بخشش کی امید رکھتے ہوئے یہ چاہیے کہ وہ خود اور ان کے اعزّہ و اقربا ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہیں۔

رہے وہ لوگ جو بار بار خطائیں کریں، بار بار گناہ کریں اور اپنے گناہوں سے تائب نہ ہوں، اسی حال میں دنیا سے رخصت ہو جائیں، وہی "مذنبین" ہیں۔ ان لوگوں کے لیے قیامت میں کوئی شفیع و مددگار نہ ہوگا۔ ملائکہ بھی اپنی دعاؤں میں ان کا ذکر نہ کریں گے۔

Marfat.com

رسولِ اکرم ﷺ کے بتائے ہوئے راستے کو پوری ڈھٹائی کے ساتھ ترک کر دینے والے کبھی رسول کے ساتھی نہیں ہو سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے بلا شبہ یہ فرمایا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعاً (53:39) ''بے شک اللہ تمام گناہ معاف کر دیتا ہے''۔ تاہم مغفرت کا دارومدار زندگی میں ہی گناہوں سے توبہ کر لینے پر منحصر ہے۔ اسی لیے تاکید فرمائی: فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ کَانَ تَوَّابًا ۝ (3:110) ''پس اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کرو بلا شبہ وہ بار بار توبہ قبول کرنے والا ہے''۔ اسی بات کو اللہ کے فرشتے اللہ کے حضور مؤمنین کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہوئے دہرا رہے ہوں گے کہ ان لوگوں کی مغفرت فرما جو توبہ کرنے کے بعد تیرے راستے کی پیروی کرتے رہے۔ (سورۃ المومن: 7)

اس طرح یہ بات واضح ہوئی کہ ''شفاعت'' یعنی مدد اور حاجت روائی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جھوٹے معبودوں کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ بے خبر ہیں، بے اختیار ہیں اس لیے وہ الٰہ اور شفیع نہیں ہو سکتے۔ اور اللہ تعالیٰ خود صاحبِ علم اور صاحبِ اختیار ہوئے ہوئے الٰہ اور شفیع ہے۔ یہی الٰہ کا اصل مفہوم ہے۔ آیۃ الکرسی میں بھی اسی بات کو پورا زور دے کر بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور پھر معین و مددگار، حاجت روا، مشکل کشا ہونے کی ساری طاقتیں اپنے لیے ہی مختص قرار دے دیں۔

روایاتِ شفاعت

جن روایات میں شفاعت بمعنی سفارش کا تذکرہ ہے، ان میں ایسے اُمور دہرائے گئے ہیں جو کسی بھی طرح قرآنی فکر سے مطابقت نہیں رکھتے۔ بتایا جاتا ہے کہ یومِ حساب اُمتِ مسلمہ پریشانی کے عالم میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ہر نبی کے پاس جائے گی اور اپنے لیے شفاعت (سفارش) کی طالب ہوگی لیکن یہ جلیل القدر انبیاء علیہم السلام بطور شہدا پیش ہونے سے پہلو تہی اختیار کریں گے۔ یہی ایک بات نصِ قرآن سے متصادم ہے جہاں ارشاد ہوا کہ ہم انبیاء علیہم السلام کو سابقہ اُمتوں پر بطور شہید بلائیں گے (41:4) لیکن روایات میں ستم بالائے ستم یہ بھی ہے کہ یہ انبیاءِ کرام علیہم السلام اپنے اپنے ''گناہوں'' کا حوالہ دیتے ہوئے فرمائیں گے کہ ہم اِس اِس وجہ سے اپنے ربّ سے شرمندہ ہیں اس لیے اللہ کے حضور پیش نہیں ہو سکتے۔ عیاں ہے کہ یہ فکر یہود و نصاریٰ کی خرافات سے مستعار لے لیا گیا ہے یا پھر اہلِ تشیع سے جو

Marfat.com

اپنے چند ائمہ کو انبیا سے برتر اور فقط انھی کو معصوم قرار دیتے ہیں۔

انھی روایات کی رو سے جب نبی اکرم ﷺ اپنے صحابہ کے لیے مغفرت کے طالب ہوں گے اور فرمائیں گے اصحابی اصحابی! تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے محمد ﷺ کیا آپ کو علم نہیں کہ آپ کے بعد آپ کے صحابہ نے کیا رویہ اختیار کیا! یہ بھی اہلِ تشیع کے نقطۂ نظر ہی کی بازگشت ہے کہ ان کے عقیدے کے مطابق سوائے چار پانچ صحابہ کے باقی سب کے سب مرتد ہو گئے اس لیے کہ وہ نعوذ باللہ پہلے ہی سے منافق تھے۔ اوروں سے کیا شکوہ، بخاری ''کتاب الانبیا'' میں بھی اسی مضمون کی وضعی عبارت موجود ہے جسے ہمارے علما صحیح حدیث قرار دیتے ہیں۔

ایسی ہی بہت سی وجوہ کے پیشِ نظر ایسی موضوع روایات کو سند مانتے ہوئے نبیِ اکرم ﷺ کو ''شفیع المذنبین'' (گناہ گاروں کی سفارش کرنے والا) سمجھ لینا برحق نہ ہوگا۔ علاوہ بریں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ کسی کی سفارش وہی کر سکتا ہے جو اس کے احوال سے پوری طرح واقف ہو۔ نبی اکرم ﷺ کو حاضر و ناظر ماننے والے شہید کے اصل معنی ''اعلانِ حق کرنے والا'' کی بجائے حاضر باش دیکھنے والا قرار دے لیتے ہیں۔ مگر یہ صفات اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں اور جس طرح پہلے بار بار ذکر ہو چکا ہے، محض اللہ تعالیٰ کا احاطۂ علم ہی تمام انسانوں کے احوال سے واقف ہے۔ کوئی اور جن و انس ایسی کسی صلاحیت سے متصف نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ کوئی نبی بھی نہیں!

قرآنِ حکیم میں مثبت انداز میں کسی شفیع کا ذکر نہیں ہے نہ حضورِ اکرم ﷺ کا نہ کسی اور کا۔ ہر جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو ہی شفیع قرار دیا ہے۔ اس کی اصل وجہ بھی قرآنِ پاک نے بار بار بیان کر دی ہے کہ کسی کا علم اتنا وسیع ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ دوسروں کی نیکی بدی، ایمان و کفر کی صحیح کیفیت سے آگاہ ہو سکے۔

نبیِ اکرم ﷺ و دیگر انبیا علیہم السلام اور اُمت کے چیدہ افراد کو شہید اور شاہد کہا گیا ہے۔ اس کا معنی احوال دیکھنے والا نہیں بلکہ اس کا معنی ہے اعلانِ حق کرنے والا (حق کی گواہی دینے والا) چنانچہ دیگر بہت سے اُمور کی طرح شاہد کے غلط معانی نے بھی شفاعت کے مفہوم کو بدل کے رکھ دیا ہے۔

شاهداً ونذيراً:

جہاں تک یومِ حساب نبیِ کریم ﷺ کے عمل کا تعلق ہے، اس میں کسی سفارش یا شفاعت کا

Marfat.com

کوئی مفہوم آیاتِ قرآنی سے ثابت نہیں ہوتا۔ اس کی بجائے وہاں بھی نبی ﷺ بطور "شاہد" اپنے ربّ کے حضور اعلانِ حق کریں گے۔ فرمایا:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا (8:48)

"اے نبی ﷺ، ہم نے آپ کو اعلانِ حق کرنے والا، خبر پہنچانے والا اور آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے"۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (78:22)

"تاکہ رسول تم پر اللہ کے دین کا اعلانِ حق کر دے اور تم دوسرے لوگوں کے سامنے اعلانِ حق کرنے والے بنو"۔

اس کا معنی یہ ہے کہ "رسول ﷺ اپنے دور کے لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچائیں اور ان کے دور کے اُمتی آگے آنے والوں کو"۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے روزِ قیامت کا حال اس طرح بیان فرمایا:

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ (89:16)

"اور خیال کرو جس دن ہم ہر اُمت میں سے ایک حق بات کرنے والا ان پر انھی میں سے اٹھائیں گے اور آپ ﷺ کو ان لوگوں، جو آپ ﷺ کے مخاطب ہیں، اعلانِ حق کرنے والا بنا کر لائیں گے"۔

اس طرح ہر اُمت کا رسول ان پر، رسولِ اکرم ﷺ اپنے دور کے اُمتیوں پر اور پھر بعد کے آنے والے شہدا اپنے اپنے دور کے لوگوں پر بطور اعلانِ حق کرنے والے کے پیش کیے جائیں گے۔ قرآنِ حکیم کی صراحت کے مطابق یہ اعلانِ حق اس بات کا ہوگا کہ ہم نے اپنے اپنے دور کے لوگوں کو اللہ کا پیغام پوری طرح سنا دیا۔ اب اگر اس دور کے لوگ اس پیغام کو نہیں مانتے یا مان کر بھی احکاماتِ الٰہی اور ارشاداتِ رسول ﷺ کی جان بوجھ کر خلاف ورزی کرتے ہیں تو انبیا اور شہدا کا یہ اعلانِ حق ہی ان "کافرین" اور "مذنبین" کے خلاف جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا "تواب" ہونا، مؤمنین کے گناہوں کو بار بار معاف کرنا، بندوں کے حق میں

Marfat.com

کتنی عظیم بات ہے۔ کس قدر محبت بھری! اللہ نے فرمایا ہے کہ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ اور فرمایا: اِنَّہٗ لَا یَاْیٔسُ من رَوْحِ اللّٰہِ الاّ القومُ الکافِرُون یعنی توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا راستہ اختیار کرنے کے مواقع کثرت سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسی خوش خبری ہے جس کے لیے کسی تحقیق کی ضرورت نہیں، کسی روایت کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ جس میں کسی غیر قرآنی فکر کی آمیزش نہیں ہے۔ بندوں کو اپنے ملیے اسی خوش خبری کو بہت جاننا چاہیے۔

اس کے باوجود جو شخص گناہوں پر مصر رہے، کسی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار ہو کر توبہ کرنے پر آمادہ نہ ہو رہا ہو، اس کی ڈھٹائی نا قابلِ فہم ہے۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ بھی بندوں پر بہت مہربان ہیں۔ روزِ حساب آپ اس گروہ کے سرخیل ہوں گے جو ملائکہ کی طرح توبہ کر لینے والے مؤمنین کی مغفرت کے لیے دعا گو ہوں گے۔ اور جو لوگ گناہ پر مصر رہے ہوں، ان کے بارے میں یہ گروہِ شہداء (یہ اعلانِ حق کرنے والا گروہ) اس بات کی گواہی دے رہا ہوگا کہ ہم نے تو انھیں ربّ کا پیغام کھول کر بیان کر دیا تھا، یہی بد قسمت ''مذنبین'' اعراض کرتے رہے، اپنے گناہوں پر مصر رہے، توبہ کرنے سے باز رہے اور حق کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

شہادتِ حق کا یہ منظر قرآنِ حکیم نے واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔ روزِ حساب اس لرزا دینے والے منظر، اس کڑی صورتِ حال کو ذہن میں تازہ رکھنے کی بجائے یہ فرض کر لیا گیا کہ نبیٔ خاتم الرُسل کی اُمت کا کوئی فرد حضور ﷺ کی ''سفارش'' کے دائرے سے خارج نہ ہوگا اور سبھی کی مغفرت ہو جائے گی۔ چنانچہ کسی خوف و خطر کی پروا نہیں۔ بس یہ دعا مانگتے رہو: وارزقنا شفاعتہٗ یو مَ القِیَامَۃِ اور بے پروا ہو جاؤ۔

ایک بار پھر یہ دیکھا جائے کہ روزِ حساب کا معاملہ اللہ نے کس طرح بیان کیا ہے۔ ایک آیت میں ارشاد ہوا کہ کسی نفس کو کوئی حمایت فائدہ نہ پہنچائے گی اور ان کی کوئی مدد نہ کی جائے گی (2:123) دوسری آیت میں ارشاد ہوا کسی نفس کی جانب سے شفاعت قبول نہ کی جائے گی (2:48) یعنی کسی کی جانب سے کسی دوسرے کی مدد کا کوئی امکان موجود نہیں اور اس کا سبب دونوں جگہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ ''اس روز کے قہر کی ہیبت سے بچو جب کسی انسان کو کسی دوسرے انسان سے فیض حاصل نہ ہو سکے گا''۔

Marfat.com

میدانِ حشر کی گھبراہٹ

سورۂ سبا کی آیت 22 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اے نبی ﷺ مشرکین جن ہستیوں کو اللہ کا شریک مانتے ہیں انھیں ذرا پکار کر تو دیکھیں، کیا وہ زمین و آسمان کی کسی ایک شے کے بھی مالک ہیں۔ قطعاً نہیں ہیں اور اسی لیے وہ کسی کی مدد سے قاصر ہیں۔ پھر ارشاد ہوا۔

اور اللہ کے حضور کسی اور کی جانب سے کسی کی شفاعت (مدد، نصرت) کام نہیں آسکتی مگر صرف اس کے لیے جس کے حق میں بات کرنے کی خود اللہ نے اجازت دے رکھی ہو۔ پھر جب (وہ لوگ جن کے حق میں بات کرنے کی اجازت دی گئی ہے) اُن کے دلوں کی گھبراہٹ دور ہو جائے گی تو وہ شفاعت کرنے والے (ملائکہ) سے پوچھیں گے: تمھارے ربّ نے کیا جواب دیا۔ وہ (ملائکہ) کہیں گے: بالکل درست جواب ملا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر ہے۔ (23:34)

اس آیۂ مبارکہ میں وقوعِ قیامت کے بعد بعث بعد الموت کے احوال بیان ہوئے ہیں۔ قیامت اور بعثت، دونوں کے احوال میں 'فزع' یعنی خوف کے باعث گھبراہٹ کا ذکر کئی بار آیا ہے اور ہر بار نئے انداز میں ہر بار کسی ایک گروہ کا ذکر کرتے ہوئے۔

انسانوں کا ایک گروہ تو وہ ہے جو ایمان لانے میں اور نیکیاں کرنے میں دوسروں سے سبقت لے جانے والا گروہ ہے۔ اس گروہ کو نہ تو صاعقۂ قیامت کا خوف ہوگا اور نہ ہی یوم حشر کے دل دہلا دینے والے حالات میں ان پر کوئی گھبراہٹ طاری ہوگی۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ (87:27)

اور کیا گزرے گی اس دن جب صُور پھونکا جائے گا اور گھبرا جائیں گے وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سوائے ان کے جنہیں اللہ اس ہول سے بچانا چاہیے اور سب کان دبائے اللہ کے حضور حاضر ہو جائیں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ○ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ○ لَا

Marfat.com

يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (21:101-103)

رہے وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے بھلائی کا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہے، تو وہ یقیناً اس جہنّم سے دور رکھے جائیں گے۔ اس کی سرسراہٹ تک نہ سنیں گے۔ اور وہ ہمیشہ اپنی من پسند چیزوں کے درمیان رہیں گے اور وہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت ان کو ذرا بھی پریشان نہ کرے گا۔ اور ملائکہ ان سے مل کر انھیں کہیں گے کہ یہ ہے وہ (بہترین انجام والا) دن جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

یہی وہ گروہ ہے جسے السّابقون السّابقون اولئك المقرّبون سب سے سبقت لے جانے والے، سب سے پہلے جنتِ نعیم میں آنے والے کہا گیا ہے، یہی لوگ ہیں جو مقرّبِ بارگاہِ الٰہی ہیں۔ مراد ہے انبیا، صدیقین اور شہدا جو نہایت قلیل تعداد میں ہیں اور اپنی وفات کے فوراً بعد جنت میں داخل کر دیے جاتے ہیں۔ زلزلۂ قیامت کے وقت وہ زندہ ہوں گے لیکن خوف اور گھبراہٹ سے محفوظ رہیں گے۔ قیامِ حشر کے وقت بھی انھیں کوئی خوف نہ ہوگا۔ وہ تو جہنم کی ہلکی سی آواز بھی نہ سنیں گے چنانچہ اس عظیم گھبراہٹ کے روز بھی محفوظ و مامون رہیں گے۔

دوسرا گروہ عادی مجرموں کا گروہ ہے۔ ان کے بارے میں فرمایا:

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ (34:51)

کاش تم انھیں اس وقت دیکھو جب یہ لوگ گھبرائے پھر رہے ہوں گے اور کہیں بچ کر نہ جا سکیں گے بلکہ قریب ہی پکڑ لیے جائیں گے۔

تیسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جن کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ وہ مؤمنین ہیں جو اپنی دنیاوی زندگی میں خطائیں کرتے رہے لیکن بالآخر انھیں مکمل ہدایت نصیب ہوئی۔ توبہ کر کے اور نیک اعمال کرتے ہوئے، ایمان کی حالت میں جب اپنے ربّ کے حضور پیش ہوں گے تو ملائکہ ان کی مغفرت کے لیے اللہ کے حضور دعائیں کر رہے ہوں گے۔ (ملاحظہ ہو سورۂ المومن آیت 7)

سورۂ سبا آیت 23 میں بھی اسی گروہ کا تذکرہ ہے۔ یومِ حساب کسی انسان کو کہیں سے کوئی شفاعت (مدد، نصرت) نہیں ملے گی مگر صرف ان لوگوں کو جن کے بارے میں ملائکہ کو ان کے

Marfat.com

حق میں دعائے مغفرت کرتے رہنے کے احکام صادر ہوئے ہیں۔

وَلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ عِندَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ ۚ حَتَّىٰ إِذَا فُزِّعَ عَن قُلُوبِهِمْ قَالُوا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۖ قَالُوا الْحَقَّ ۖ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ (23:34)

اور اللہ کے حضور کوئی شفاعت بھی کسی کے لیے نافع نہ ہوگی بجز اس کے جس کے لیے اللہ نے شفاعت کی اجازت دی ہو حتیٰ کہ جب ایسے لوگوں کی گھبراہٹ دور ہوجائے گی تو وہ ملائکہ سے پوچھیں گے کہ تمھارے ربّ نے کیا جواب دیا۔ وہ کہیں گے کہ ٹھیک جواب دیا۔ وہی اللہ بزرگ و برتر ہے۔

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے بار بار یہ فرمایا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا شفیع (حامی و ناصر) نہیں ہے تو ہمیں پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی سب باتیں مان لینی چاہئیں۔

الف- اللہ کے سوا کوئی شفیع نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی بھی اور کے سامنے سفارش داخل کرنے کا ہر تصور بے معنی ہے۔ مان لینا چاہیے کہ شفاعت کے معنی میں ''سفارش'' کا کوئی دخل نہیں۔

ب- روزِ حساب، سفارش تو رہی ایک طرف، کسی بھی انسان کو کسی دوسرے کے بارے میں فکر کرنے کا ہوش تک نہ ہوگا۔ کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ ایسے میں صرف ملائکہ کی مدد و نصرت شاملِ حال ہوسکے گی۔

ج- ملائکہ اللہ کی جانب سے مقرّر کردہ کارکنان قضاوقدر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس دُنیاوی زندگی میں بھی جس کی مدد کرنا ہو، ملائکہ کے ذریعے بھی کرتا ہے۔ چنانچہ ملائکہ کا ان لوگوں کے لیے استغفار جو توبہ کرکے اور نیک عمل کرتے ہوئے میدان حشر میں پہنچے ہیں، اللہ ہی کی جانب سے ہے۔

د- ایسے مؤمنین جو مُذنبین کی حالت میں نہیں بلکہ توّابین ہوکر اللہ کے حضور حاضر ہوئے ہیں، یقیناً اپنے سابقہ گناہوں پر پکڑ کے خوف سے گھبراہٹ میں مبتلا ہوں گے مگر فرمایا کہ ان کا یہ خوف جلد ہی دو ہوجائے گا۔ ملائکہ کے استغفار کی بدولت وہ سکونِ قلب پاکر ملائکہ سے دریافت کریں گے کہ تمھارے ربّ نے ہمارے بارے میں کیا حکم فرمایا ہے، جواب ملے گا۔ اَلْحَقّ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا سچا وعدہ ہے کہ سکراتِ موت سے قبل توبہ کرنے والوں سے مکمل درگزر فرمائے گا اور یہ سچّا وعدہ تمھارے حق میں بھی پورا ہوکر رہے گا۔

Marfat.com

تقدیر کا مسئلہ

دنیا میں اپنے اعمال وافعال کے لیے انسان مجبور ہے یا آزاد۔۔۔ یہ فلاسفہ کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے پر جب انسانوں نے اپنے ہی علم اور اپنی ہی عقل پر انحصار کر کے غور وفکر کیا تو دو مسلک وجود میں آئے۔ ایک قدریۃ جن کا کہنا ہے کہ انسان مختار ہے، اس کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ انسان تقدیر کا اسیر اور پابند نہیں ہے:

اَلْقَدَرِیَّۃ : قَومٌ یَجْحَدُونَ الْقَدَرَ. یَقُولُون انَّ کُلَّ عبدٍ خَالِقٌ لفعلہٖ ولا یرون الکفر والمعاصی بتقدیر اللہ تعالی

''وہ لوگ جو انسان کو مجبور اور پابندِ تقدیر نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں کہ ہر انسان اپنے افعال کا خود ہی خالق ہے۔ اور کفر ومعصیت (کے افعال) کو اللہ کی جانب سے طے شدہ نہیں سمجھتے''۔

دوسرا مسلک جبریۃ کا ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ انسان اپنے اعمال وافعال میں خود مختار اور آزاد نہیں ہے بلکہ ہر لحاظ سے عمل، قول اور فعل میں تقدیر کا پابند ہے۔

یہ دونوں رُخ دو انتہاؤں کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان آرا کی تشکیل میں خود خالقِ کائنات کی رائے، اس کے بنائے ہوئے قواعد وقوانین سے اور اس کے طے کردہ ضابطوں سے کوئی استفادہ نہیں کیا گیا۔ یہ بات لائقِ صد افسوس ہے کہ دوسری صدی ہجری میں مسلمان مفسرین نے بھی قرآنِ حکیم سے رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے فلسفے کو ہی اپنے فکر کا منبع اور معیار بنا لیا۔ حالانکہ یہ مسئلہ دین کا مسئلہ نہیں، مسلمانوں کا مسئلہ نہیں۔ دین نے ہمیں قرآنِ حکیم کے ذریعہ انسان، کائنات اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے درمیان تعلق اور روابط کے بارے میں صدیوں پہلے درست رہنمائی دے دی ہے اور بتا دیا ہے کہ انسان کس حد تک مجبور ہے اور کس

Marfat.com

حد تک مختار۔ اگر تخلیقِ انسان کی نوعیت کو اچھی طرح جان لیا جائے اور انسان کے مقصدِ تخلیق سے آگاہی حاصل کر لی جائے تو مسئلہِ جبر و قدر دین کا مسئلہ ہی نہیں رہتا۔

❁❁❁❁

مسئلہِ جبر و قدر کے کم از کم تین ایسے پہلو ہیں جن سے صرفِ نظر کی بنا پر جبریہ اور قدریہ کے مباحث نے لایعنی اور غیر مختتم بحث کا رخ اختیار کر لیا ہے۔ اور درحقیقت تو سبھی فلاسفہ اور متکلمین (خواہ جبریہ ہوں یا قدریہ) انسان کو قطعی جبر کی حالت میں مان کر، دین کے مطالبات کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔

ایک پہلو اس مسئلے کا قرآنی الفاظ اور اصطلاحات کی غلط تفہیم ہے اور آیاتِ قرآنی کی غلط ترجمانی ہے۔ مثلاً زبانِ زدِ عام ہے کہ ''اللہ کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہلتا''۔ حالانکہ قرآن کے الفاظ یوں ہیں: وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا (59:6) ''اور درخت سے گرنے والا کوئی پتہ ایسا نہیں جس کا اسے (اللہ کو) علم نہ ہو''۔ اب ان دونوں باتوں میں جو فرق ہے وہ صاف ظاہر ہے۔ پھر یہ کہا جاتا ہے کہ ''اللہ کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا''۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں بہت سے اُمور کے بارے میں فرمایا کہ یہ سب کچھ اللہ کے اِذن سے ہوتا ہے اور اللہ کے اِذن کے بغیر نہیں ہوتا، نہیں ہوسکتا۔ ان تمام آیات کے ایک مجموعی تاثر کو باذن اللہ کہہ کر اِذن کے معنی حکم قرار دے دیے گیے۔ حالانکہ اِذن کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ کے علم سے ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتے ہوئے، اس کی دی ہوئی رخصت (اجازت) کے تحت فلاں فلاں کام کرتا ہے، کرے گا یا کر سکتا ہے۔ مشرکین کو یہ زعم تھا کہ ان کے جھوٹے اِلٰہ (اُن کے نقطہِ نظر کے مطابق اُن کے معبود اور حاجت روا) بارگاہِ الٰہی میں ان کی شفاعت (جس کا معنی سفارش سمجھا گیا ہے) کر دیں گے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسا کیوں کر ممکن ہے، جو بات اللہ کے علم میں نہیں، جس کی کوئی اجازت، رخصت اللہ نے نہیں دی، وہ بات کیسے ہوسکتی ہے۔

لفظ تقدیر کا معنی نصیب کا لکھا، مقدر اور قسمت سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ قرآنِ حکیم میں یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے ایسے ہی معنوں میں ہے جیسے انگریزی میں کہا جائے:

To assign value to something

Marfat.com

''کسی شے کو اس کی قدر و قیمت سے نوازنا''

لیلۃ القدر کیا ہے ۔۔۔ بڑی اہمیت والی رات۔ اس رات میں نزولِ قرآن کے سبب اس رات کی اہمیت اور فضیلت ہزار مہینوں کے دورانیے سے بڑھ کر ہوگئی۔ یہ عزت و افتخار اس رات کو نزولِ قرآن کے باعث ملا۔ قَدَّرَهٗ تَقْدِيْراً ۔ فلاں شے کو اللہ تعالیٰ نے پورے پورے اندازے پر ترتیب دیا یعنی اس شے کو اسی کی مخصوص Values عطا کر دیں۔ لیلۃ القدر کو اہمیت اور فضیلت، نزولِ قرآن کے ذریعے عطا ہوئی۔ اس طرح اس رات کی قدر و منزلت کا فیصلہ ہوا۔ اسی لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اس رات میں قرآنی وحی کے ذریعے حکمت بھرے احکام اور معاملات کو کفر سے ممیز کر کے، ان کے درمیان فرق کو اجاگر کر کے انسانیت پر احسانِ عظیم کیا گیا۔ سورۃ الدخان میں فرمایا: فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ (ہر حکمت بھری بات کو کھول کر بیان کیا جاتا ہے) گویا اس رات میں لوگوں کی ''قسمتوں'' کا فیصلہ اور رزق کی تقسیم جیسی باتیں غلط ہیں اور خود ساختہ ہیں۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (2:25) ''اللہ نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا ایک اندازہ مقرر کیا''۔ اس طرح اللہ نے اپنی مخلوقات کے ظہور، بقا، قیام اور عمل و فعل کے لیے مواقع اور ذرائع اور حدود طے کر دیں۔ ایک اور جگہ بھی قرآنِ حکیم میں لفظ تقدیر آیا ہے۔ فرمایا:

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ
ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (96:6)

پردۂ شب کو چاک کر کے وہی صبح نکالتا ہے۔ اسی نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے۔ اسی نے چاند اور سورج کے طلوع اور غروب کا سامان مقرر کیا ہے۔ یہ سب اسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھہرائے ہوئے اندازے ہیں''۔

جو کسی شے کی صفات ہوں گی، جس طرح اس کی نشوونما ہوگی، اس کے اعمال و افعال جس انداز میں، جن جن صورتوں میں انجام پذیر ہوں گے، ان حدود و قیود کا تعین کر دیا نہ کہ ہر ہر عمل و فعل کا۔ دراصل یہ اندازہ وہ تمام امکانات ہیں جو کسی شے کی تخلیق کے دوران میں اس شے میں

Marfat.com

رکھ دیے جاتے ہیں۔ مثبت و منفی، نیک و بد افعال، خیر اور شر کے تمام پہلو۔ اب یہ تخلیق پر منحصر ہے کہ وہ ان امکانات کو کس طرح دریافت کرتی اور ظہور میں لاتی ہے۔ عربی زبان میں اَلْقَدَرُ کہتے ہیں مَبْلَغُ الشَّئی (کسی شے کی حدودِ ذات اور حدودِ کار) اَلطَّاقَةُ وَالْقُوَّةُ (اس شے میں جو صلاحیتیں ہیں) اور قَدَّرَ کے معنی ہیں دَبَّرَ وفَکَّرَ فِی تَسْوِیَتِہٖ (اللہ نے کس طرح کسی شے کو بنانے اور سنوارنے میں غور وفکر فرمایا، اس کا حکم، صفات اور حدود طے کیں)

اللہ تعالیٰ ہر مخلوق کی حدود و قیود مقرر کرتا ہے، یہی اس کی تقدیر ہے یعنی ہر شے کا درست اندازہ کرنا، اس کے ممکنہ اعمال وافعال کے تمام امکانات کی رخصت دے دینا۔

❁❁❁❁

مسئلۂ جبر وقدر کا دوسرا پہلو انسان کی دو مختلف حیثیتوں کی تفہیم ہے۔ ایک طرف انسان کائنات کی دوسری تمام اشیا کی طرح ایک مخلوق ہے جسے بڑھنے پھولنے، کھانے پینے اور سونے جاگنے کی صلاحیتیں دے کر اس نظام کا ایک حصہ بنا دیا گیا ہے۔ دوسری حیثیت میں انسان کائنات کی دیگر تمام اشیا، تمام مخلوقات سے ممتاز ہے۔ اس حیثیت میں انسان کو ارادہ واختیار کی اقدار دے کر ایک امتحان گاہ میں ڈال دیا گیا ہے۔ ساری کائنات میں سے انسان ہی احسنِ تقویم ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا

(72:33)

"ہم نے اس امانت (عقل، ارادہ، اختیار) کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے۔ مگر انسان نے اس امانت کو اٹھالیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے"

(یعنی امانت اٹھانے کے بعد اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتا۔)

اس آیۂ مبارکہ میں ارض وجبال کے ساتھ السماوات کہہ کر اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کی تمام مخلوقات کا احاطہ کر دیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ انسان ہی پوری کائنات میں واحد منتخبِ روزگار ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی حکمت کا ایسا شاہکار ہے جسے عقل اور ارادے کی نعمتوں سے مالا مال کر کے اس امتحان گاہِ دنیا میں بھیج دیا گیا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ نیکی اور بدی کو

Marfat.com

ایک دوسرے سے ممتاز دیکھنے کی فطری صلاحیت کے باوصف اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسولوں اور کتابوں کی آمد کے باوجود وہ اللہ کا بتایا ہوا راستہ اختیار کرنے سے اجتناب تو نہیں کرتا۔

اپنی پہلی حیثیت میں انسان ساری کائنات کے ہم پلہ ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا۔ (12:41) ''اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا''۔ تمام آسمانوں کو سورج، چاند، ستاروں کو مخصوص وضع دے کر متعین فرائض بھی سونپ دیے گئے ۔بعینہٖ انسانوں کو ہاتھ پاؤں اور زبان دے کر تمام اعضا و جوارح کی حدود بھی مقرر کر دی گئیں۔ انسان مختار ہے اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں لیکن ایک خاص دوری تک۔ آزاد ہے ہاتھ اور پاؤں کو حرکت دینے میں مگر جہاں تک ان اعضا کی پہنچ ہے۔ دوسری طرف اس کے ارادہ و اختیار کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ، قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (256:2) ''دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت (صحیح بات) کو غلط خیالات سے الگ کر کے انسانوں پر واضح کیا جا چکا ہے''۔ انسان کی ان دونوں حیثیتوں کو الگ الگ ہی دیکھنا ہوگا۔ کوئی شخص اللہ کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ اُسے اتنی ہی لمبی ٹانگیں دے دی جائیں جتنی دور وہ قدم رکھنا چاہتا ہے۔ اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ سے اس کا یہ حق چھین نہیں سکتا کہ اس نے یہ امتحان گاہ کیوں ترتیب دی۔ انسان بھی وحشی جانوروں کی طرح ہر پابندی سے آزاد رکھ کر کھلا کیوں نہیں چھوڑ دیا گیا!

❁❁❁❁

مسئلہ جبر و قدر کا تیسرا پہلو جسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے، یہ ہے کہ قرآنِ حکیم ایک حکمت والے دانا اور صاحبِ قوت و جبروت الٰہ الحق کا کلام ہے۔ یہ کوئی ٹیکسٹ بک نہیں کہ اس میں تمام باتیں موضوع وار کہی گئی ہوں اور ہر باب میں کسی ایک موضوع پر بالترتیب باتیں لکھ دی گئی ہوں۔ اس کے برعکس یہ کتابِ ہدایت تئیس برسوں میں نازل ہوئی۔ اس کتاب میں انسان اور کائنات کے اللہ سے رشتے کی تمام وضاحتیں جگہ بہ جگہ دے دی گئی ہیں، ہر موقع اور ہر محل کی مناسبت سے الگ الگ الفاظ اور الگ الگ انداز میں۔ آیاتِ انفس و آفاق کو طرح طرح سے بیان کرتے ہوئے تاریخِ افراد و امم کو مواقع کی مناسبت سے پیش کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ خیر و شر کے ہر پہلو کی وضاحت فرماتا ہے، حکایات و قصص کے ذریعے، امثال و تشبیہات کے ساتھ۔ اس میں دلائل و براہین بھی ہیں اور موعظت و نصیحت بھی۔

Marfat.com

ہر موقعے کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ کا ذکر بھی کرتا ہے، اپنے اختیار و اقتدار کو مجمل طور پر بھی بتاتا ہے اور مفصّل بھی۔ دوسری جانب اپنے بندوں کی صلاحیتوں اور ان کے دائرۂ عمل کی وضاحت بھی کرتا ہے اور ان کے ارادہ و عمل کی نارسائیوں کا بیان بھی اس کتاب میں موجود ہے۔ یہی سبب ہے کہ کہیں اللہ تبارک وتعالیٰ یہ کہہ دیتا ہے کہ بندے کو اختیار اور ارادہ تفویض کر دیا گیا ہے اس لیے وہ خود مختار ہے۔ کہیں یہ بندہ مخلوق ہے، کسی مختارِ کل کی طرف جھکنے پر مجبور ہے اور یہ کہ وہ مختارِ کل وہ الٰہ العالمین خود ہی خیر و شر کا خالق ہے، ابلیس کو ضلالت و گمراہی کی رخصت دینے والا بھی وہ خود ہی ہے۔ اسی نے نیکی اور بدی کی آویزش کی بنیاد رکھی ہے۔ اسی نے انسان کو خیر و شر میں سے کسی ایک کے انتخاب کا مختار بنایا ہے، اسی نے قلب و ذہن کو ہر دو طرح کے اعمال میں تمیز کی آزادی دی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ہی مختارِ کل ہے، انسان محتاجِ محض ہے۔

وہ الٰہ العالمین جو پوری کائنات کا خالق، بدیع اور فاطر ہے، وہی مختارِ کل اور قادرِ مطلق ہے۔ کوئی اس ذات سے اس کا یہ حق چھین نہیں سکتا کہ وہ اپنی کس مخلوق کو کیسے پیدا کرتا ہے اور اس کا دائرۂ عمل کس طرح سے متعین کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی ایک عملی مثال سے اس بات کو پوری طرح واضح کر دیا جب آدم اور اولادِ آدم کو زمین میں خلیفہ (حکمران) بنانے پر اعتراض کرنے والے ابلیس کو ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ قرار دے دیا۔ آج بھی اولادِ آدم میں سے جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق، اس کے انتظام اور اس کی ترتیب پر اعتراض کرتا ہے، کہتا ہے کہ انسان اس حد تک مختار کیوں ہے اور اُس حد تک مجبور کیوں، وہ اس قادرِ مطلق پر اعتراض کر رہا ہے اور ویسا ہی راندۂ درگاہ ہے جیسے کہ ابلیس!

یہ الگ بات ہے کہ ابلیس کی جانب سے یہ اعتراض بھی اللہ تعالیٰ کے وسیع پروگرام کا ہی ایک حصہ تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ ۫ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۝ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ

(2:67)

”نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (جو کچھ چاہے کر سکتا ہے، کوئی چیز اسے

Marfat.com

عاجز کرنے والی نہیں) جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تا کہ تم لوگوں
کو آزمائش میں ڈالے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے
(انسانوں کو یہ موقع دے کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور اپنے امکانات کو کس
طرح استعمال کرتے ہیں)

اس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بنی نوعِ آدم کے لیے اپنے پروگرام سے مطلع کیا ہے اور اس دوران میں بار بار اختیار واقتدار، انسانوں کو تفویض کی جانے والی صفات اور ان کی اہلیت اور انسانوں کے محدود دائرۂ عمل سے بھی انھیں آگاہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ پاک کی بہت سی آیات ایک دوسری سے بظاہر متناقض نظر آتی ہیں لیکن تخلیقِ انسان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے پروگرام کو ماننے والے تمام اہلِ اسلام کی نظر میں ان گونا گوں توضیحات کی اصل اہمیت واضح ہے اور ان دلائل و براہین کو ثباتِ قلب اور تقویتِ ایمان کا باعث جانتے ہیں۔

✿✿✿✿

فلاسفہ ہوں یا متکلمین، متصوفین ہوں یا کسی بھی مذہب کے حکماء و مبلغین، سبھی انسان کو بالآخر جبر کا اسیر ہی تصور کرتے ہیں اور جو دانش ور یہ کہتے ہیں کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے ۔۔۔انسان کے لیے پہلے سے کچھ طے شدہ نہیں ۔۔۔ اپنے لیے اقدارِ حیات بھی انسان خود ہی تخلیق کرتا ہے اور اپنی زندگی کا پروگرام خود ہی وضع کرتا ہے ۔۔۔ تو ایسے سبھی ذہنی آوارگی کے شکار افرادِ انسانیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت، کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتے ہیں۔ اللہ کی جانب سے بخشی ہوئی رہنمائی تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ایسے منکرینِ توحید و رسالت کو اللہ تعالیٰ نے ایک چیلنج کرتے ہوئے مسکت جواب دیا ہے:

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِيْنَ ○ عَلَى أَنْ نُّبَدِّلَ
أَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (60-61:56)

”ہم نے ہی تمھارے درمیان موت کا پروگرام طے کر دیا ہے اور ہم اس بات
سے عاجز نہیں ہیں کہ تمھاری موت کا پروگرام بدل ڈالیں اور تمھیں اس طرح
ایسی کیفیت میں دوبارہ پیدا کر دیں جس کا تمھیں کچھ اندازہ نہیں“۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نورِ ہدایت کے منکرین کو یہ باور کروا رہا ہے کہ تم کس بات پر اکڑتے

Marfat.com

اور اتراتے ہو، تم کون سی حدیں پھلانگ سکتے ہو، سارا اختیار و اقتدار تو اس خالق و مالکِ حقیقی کا ہے جس نے تمھیں ایک خاص شکل میں، خاص صفات اور کمالات کے ساتھ پیدا کیا، وہی یہ سب کچھ تم سے چھین بھی سکتا ہے۔ تمھارا کام تو بس یہ ہے کہ اپنی تمام صلاحیتوں اور توانائیوں کو اسی الٰہیاتی نظام کی تعمیر و تشکیل کے لیے استعمال کرو، تمھیں اس پروگرام سے سرتابی کی مجال نہیں۔

انسان کو مجبورِ محض قرار دینے والے حکیم اور دانش ور بھی اس دنیا کے، انسان کے لیے دارالامتحان ہونے اور انسان کے مبتلائے آزمائش کیے جانے کے اُصولی تصور کو تسلیم نہیں کرتے اور دنیا کے وسائل کو انسانیت کی بہتری کے لیے استعمال کرتے ہوئے اللہ کی بندگی اور رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع سے بالفعل گریزاں ہیں۔ ان لوگوں کا ایک بڑا طبقہ وحدۃ الوجود کا سہارا لیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ انسان ذاتِ حق سے ٹوٹا اور بچھڑا ہوا، اس مادی دنیا میں بھٹکتا ہوا ایک ناقص وجود ہے۔ انسان کو چاہیے کہ دنیا کی ان قابلِ نفرت آلائشوں سے دور رہ کر، اپنے من کو مار کر، اپنے آپ کو فنا فی اللہ کرنے کی جدوجہد کرتا رہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں واضح طور پر بتا دیا ہے کہ وہ خالق ہے، ہم مخلوق اور دنیا کی نعمتیں اس نے ہماری دسترس میں رکھ دی ہیں۔ اور یہ کہ ان وسائلِ حیات سے ہم نے خود بھی استفادہ کرنا ہے اور معاشرے کو بھی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا ہیں۔ اہلِ اسلام سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے اس نظام کے جبر کی کوکھ سے ہی انسان کی خود اختیار کردہ آزادی جنم لے سکتی ہے جہاں اللہ کی رضا حاصل کرنے کے متمنی افراد دنیاوی زندگی کی نعمتیں اجتماعیت کی بہبود کے لیے صرف کرتے اور عدلِ اجتماعی پر قائم نظام کی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔ انسان کو مجبورِ محض قرار دے کر جدوجہد، جہاد اور اجتہاد سے گریز پائی کا سبق اہلِ اسلام کو (تصوف اور عقیدۂ وحدۃ الوجود کی شکل میں) صدیوں پہلے دیا گیا تھا اور مسلمانوں کی یہ حالتِ زار اسی کا ثمرہ ہے۔

❁❁❁❁

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک مخصوص ڈھنگ پر تخلیق کیا ہے اور کائنات کی ہر دوسری شے کی طرح اس کے اعمال کا دائرۂ کار بھی محدود ہے۔ تاہم اللہ کی بنائی ہوئی سکیم کچھ اہم فیصلوں کی متقاضی تھی اور خالقِ کائنات نے کم از کم تین ایسے انتظامات فرما دیے کہ یہ سکیم پوری طرح کامیاب رہے۔ اس سکیم کا لبِ لباب یہ ہے کہ انسان کو وسائلِ حیات دیے گئے ہیں اور اسے نورِ

Marfat.com

ہدایت بخشا گیا ہے۔ اب کون اپنے الٰہ الحق کو اس کی نشانیوں اور اس کی صفات کے ذریعے پہچانتا ہے، اس کی عبودیت میں آجاتا ہے اور کون ہے جو اس نظام کی ترتیب اور ساخت پر ہی نکتہ چینیاں کرنے لگ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پہلا انتظام یہ کیا کہ اجرامِ فلکی کے رواں دواں رہنے سے سردی گرمی بہار خزاں برسات کے موسم بنادیے اور رات دن مہینے اور سال ترتیب دے دیے۔ اسی نظام کے طفیل انسان اپنے شب وروز اور ماہ وسال گزارتا ہے۔ سورج کی گرمی اور توانائی، زمین کی نشوونمو کی صلاحیت، پانیوں کی روانی، پودے اور درخت، پھول اور پھل، چرند اور پرند غرض ہر نوع کی مخلوق انسان کی دسترس میں ہے۔ اسی لیے فرمایا:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (13:45)

"اور اس نے زمین اور آسمانوں کی تمام چیزوں کو تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ سبھی کچھ اپنی جانب سے۔ اس بات میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کرنے والے ہیں"۔

انسانوں کو یہ ساری صلاحیتیں بخشنے اور یہ وسائل اس کے لیے مسخر کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ انسان کو اس دنیا میں خلیفہ یعنی حکمران بنایا گیا ہے۔ استخلاف فی الارض کے لیے اللہ کے مطیع یا باغی ہونے کی کوئی تمیز روا نہیں رکھی گئی تاہم مؤمنین سے یہ وعدہ ضرور ہے کہ اگر وہ اللہ کے پروگرام کے مطابق چلنا چاہیں تو انھیں بھی یہ حکمرانی مل سکتی ہے اور اس کی شرطِ اوّلین توحید پر ثابت قدم ہونا اور شرک سے اجتناب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے طے کردہ پروگرام کے لیے دوسرا انتظام یہ فرمادیا کہ انسان کو فطری طور پر خیر اور شر میں تمیز کی صلاحیت دے دی گئی۔ مزید براں اللہ تعالیٰ نے اپنے منتخب بندوں کے ذریعے اور اپنی بھیجی ہوئی وحی کے ذریعے انسانوں کو ہدایت بھی پہنچادی یعنی زندگی گزارنے کا وہ طریقہ بھی بتادیا جو اللہ کو پسند ہے۔ ایسا طریقہ جو عدل پر مبنی ہے، ظلم کا راستہ روکتا ہے۔ ظلم یہ بھی ہے کہ انسان اپنے خالق ومالک کو بھول جائے اور یہ بھی ظلم ہے کہ اپنے ہم نفس انسانوں کی ضروریات کو بھلادے۔ اسی خاطر انسان کو بارِ امانت دیا گیا ہے یعنی عقل، ارادہ اور اختیار۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے تیسرا انتظام یہ فرمادیا کہ انسان اور کائنات کی تخلیق میں لگائی گئی پابندیوں اور انسان کے عمل و فعل کی محدودیت کے باوصف اللہ تعالیٰ نے اس ساری سکیم میں امکانات کی ایک لامتناہی دنیا آباد کردی ہے۔ انسان کو یہ امکانات تلاش کرنا ہیں اور انھیں بروئے کار لاتے ہوئے خیر اور شر میں تمیز روا رکھنی ہے، اللہ کے بھیجے ہوئے نورِ ہدایت کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کرنا ہے۔ زندگی کا راستہ پُر پیچ ہے اور اس میں امکانات کی وسعت حیران کن ہے۔ انسان کو اس بات کی پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ خیر کا راستہ اپنائے یا شر کا۔ اس کی ایک سادہ سی مثال کمپیوٹر گیم ہے۔ گیم کے کردار چل رہے ہیں، دوڑ رہے ہیں، فائر کر رہے ہیں، لڑ رہے ہیں، مر رہے ہیں، بچ رہے ہیں، چیزیں اٹھا رہے ہیں، پھینک رہے ہیں۔۔۔ کی (key) بورڈ پر بیٹھنے والا اپنے ارادہ و اختیار کے بل پر جب جہاں چاہے Click (کلک) کرتا ہے۔ لحہ بہ لحہ صورتِ حال بدلتی جاتی ہے۔ ہر کھلاڑی کا طریقِ کار، راستہ اور تیکنیک مختلف ہے۔ جس جس طرح چاہو اپنی سکیم بدل بدل کر کھیلو، امکانات ختم ہونے میں نہیں آتے۔ یہ انسانی کاوش ہے۔ فاطرِ حقیقی، بدیعُ السَّمٰوٰتِ والارض کی بنائی ہوئی دنیا کا کیا کہنا۔ زانکہ تقدیراتِ حق لاانتہا است!

❁❁❁❁

انسان کو مجبورِ محض قرار دے کر اسے اس ذمہ داری سے بری قرار نہیں دیا جاسکتا جو خالقِ کائنات نے اس پر ڈال دی ہے۔ یہ ایک منفی رویہ اور اس کے مہلک اثرات کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مبین میں واضح کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر کفّار یعنی اللہ تعالیٰ کی سکیم کے منکرین کا یہ رویہ کہ جب انھیں کہا جاتا کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو تو وہ جواباً جبریہ جیسی فکر کا اظہار ان الفاظ میں کرتے:

وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطۡعَمَهٗۤ ٭ۖ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ

(47:36)

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو رزق تمھیں دیا ہے اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں بھی خرچ کرو۔ تو یہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے ایمان لانے والوں کو جواب دیتے ہیں۔ کہ کیا ہم ان کو کھلائیں، جنھیں اگر

Marfat.com

اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا (گویا بھوکا رہنا ان کی ''تقدیر'' میں لکھا ہے) تم تو بالکل ہی صریح گمراہی میں ہو (تقدیر کے جبر کو نہیں مانتے۔)''

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے جو نظامِ اقدار بنایا ہے اس کی اچھائیوں کو پالینا بھی انسان کے اختیار میں ہے اور اس کی برائیوں کو پھیلا دینا بھی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو ہدایت انبیا کے ذریعے ہمیں دی ہے اس میں بہت زیادہ زور انسان کی معاشرتی زندگی کی فلاح پر ہے۔ اسے ہم عدلِ اجتماعی بھی کہتے ہیں۔ تمھیں جو کچھ دیا گیا ہے یا جو کچھ تم نے اپنے علم وفن کے ذریعے کمایا ہے وہ محض تمھارا نہیں ہے۔ تمھارے اس مال میں مانگنے والوں کا بھی حق ہے اور ان کا بھی جو مانگتے نہیں لیکن محروم ہیں۔ تمھیں اس مال کو اپنی تجوریوں میں سینت سینت کر رکھنے کی اجازت نہیں۔ مال کو مستحقین میں تقسیم کر دو یا اس مال سے ایسا کاروبار کرو جس سے ہزاروں افراد کو روزگار ملے اور ان کا بھلا ہو۔ اپنے مال کو اپنے اعزہ واقربا، اپنے پڑوسیوں اور مستحقین میں تقسیم کرو۔ تم اپنی ان مساعی سے معاشرے کا دکھ درد ختم کرنے کے مکلف ہو۔ اس طرح ایک آسودہ حال ریاست تشکیل پاسکتی ہے اور اسی طرح اللہ کی رضا حاصل ہوسکتی ہے۔

❁❁❁❁

اس مضمون میں ہم ایک بار پھر ان اُمور کا احاطہ کرنا چاہیں گے، ان تصورات کا جو عوام و خواص میں رائج ہیں۔ جن سے تقدیر کا ایک غلط تصور ذہن میں بیٹھا ہوا ہے اور غلطُ العام توجیہات وتعبیرات نے مسئلے کو الجھا دیا ہے۔

تقدیر کا معنی ہے کسی چیز کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا۔ اس کا مادہ اَلْقَدَرُ ہے جس کا معنی ہے حکمِ اشیا یعنی کسی شے کی حدودِ کار کا تعین۔۔۔ مَا یُقَدِّرُ اللّٰہُ مِنَ الْقَضَایَا (جس طرح اللہ اپنے ضابطوں کا اندازہ مقرر کرتا ہے) اَلْقَدَرُ کا بھی ایسا ہی مفہوم ہے۔ کسی شے کی عزّت و وقار۔ جیسے لیلۃ القدر جو نزولِ قرآن کے طفیل عزت ووقار کی حامل رات قرار دی گئی۔ التّقدیر کا معنی ہوا اندازۂ خداوندی۔ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو اس کی صفات عطا کیں اور اس کی حدودِ کار متعین کرتا ہے۔ اس کے بعد ہر شے کو کچھ ضابطوں اور قوانین کا پابند رکھ کر نشوونما اور عمل وفعل میں آزاد چھوڑ دیا ہے، بالخصوص انسانوں کو۔ اب یہ انسان کی مرضی ہے کہ نیکی کرے یا برائی۔

Marfat.com

انسان اپنے علم اور اپنی صلاحیت سے اپنا رزق بڑھا بھی لیتا ہے کم بھی کر لیتا ہے۔ کفار اپنی اس فنکاری پر نازاں ہو کر اس عمل کی تہہ میں مشیتِ الٰہی کی کارفرمائی سے سرتاسر انکار کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف وہ خوش عقیدہ لوگ ہیں جو اچانک فائدے اور اچانک نقصان کو تائید ایزدی یا تنبیہِ خداوندی قرار دینے پر مصر ہیں۔ جبکہ کروڑوں انسانوں کو نفع و نقصان سے ہر روز دوچار ہونا پڑتا ہے، باوجود اس کے کہ بھلائی کی سوچ رکھنے والے نقصان کرتے نظر آ رہے ہیں اور نفع کمانے والے چوری اور ہیرا پھیری کے راستے اپنائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہ ثابت ہوا اور یہی بات اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں بھی بتا دی ہے کہ وہ بے نیاز ہے، کسی بندے کی جانب سے عبادت گزاری کا محتاج نہیں۔ رزق بے حساب دیتا ہے، نیک و بد اشخاص کی تقسیم روا نہیں رکھتا۔

تقدیر کے بارے میں انسان کے مجبورِ محض ہونے کے نظریے کو تقویت قرآنِ حکیم کی آیات کی غلط ترجمانی سے ملی ہے۔ مثلاً لیلۃ القدر کو انسانوں کی ''تقدیر'' کے تعیّن کی رات قرار دے دیا گیا حالانکہ اللہ تعالیٰ کی منشا یہ ہے کہ اسے نزولِ قرآن کی مناسبت سے عزّت و وقار والی رات کہا جائے۔ سورۂ دخان کی جس آیت میں لیلۂ مبارکہ کا ذکر ہے اسے لیلۃ القدر (رمضان کے آخری عشرے کی ایک رات) ماننے کی بجائے اس کا تعلق پندرہ شعبان کی رات سے جوڑ کر تقدیرات اور تقسیمِ رزق کی رات قرار دے دیا گیا۔ قرآنِ حکیم نے اس رات کے بارے میں بتایا: فیھا یفرق کلّ امر حکیم۔ اب اس آیت میں اکثر مفسرین نے یفرق کے معنی بانٹ دینے کے لے لیے اور امرِ حکیم سے مراد لے لیا ''سال بھر کا رزق''۔ عربی زبان و ادب کے کسی قاعدے کی رو سے ان الفاظ کے یہ معنی نہیں نکلتے۔ اصل میں اس آیت میں وحیٔ الٰہی، قرآنِ حکیم ہی کا ذکر ہے کہ حکیمانہ باتوں کے ذریعے خیر و شر میں فرق واضح کر دیا گیا ہے۔ قرآنِ پاک اپنے آپ کو ''فرقان'' کہتا ہے۔ چنانچہ ان آیات میں سارا ذکر قرآنِ حکیم ہی کا ہے اور اس حوالے سے لیلۃ القدر کا ذکر نہ کسی خود ساختہ لیلۃ البراءۃ کا!

تقدیر کو انسان کی قسمت، اس کا نصیب یا انگریزی زبان میں Fate or Destiny ثابت کرنے کے لیے علما نے (اللہ ان پر رحم کرے) دو کام اور بھی کیے ہیں۔ جب بچہ پانچ چھ برس کا ہوتا ہے تو اسے ایمانیات کا درس دیتے ہوئے پانچ ایمانیات (جن کا ذکر قرآنِ حکیم میں کیا گیا ہے۔۔ توحید، ملائکہ، کتب، رسالت اور معاد) میں ایک اور شعبۂ ایمان کا اضافہ کر

Marfat.com

کے بچے کو یہ الفاظ بھی رٹا دیے جاتے ہیں: وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَ شَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی۔ (اور اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ اچھی اور بری تقدیر اللہ ہی کی طرف سے ہے) اس طرح جبر یہ فلاسفہ کا نقطۂ نظر، ظالم و جابر حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وضع کیا گیا۔ یہ خوفِ خدا سے عاری حکمران مظلوم و مقہور، پسے ہوئے، ضروریاتِ زندگی سے محروم عوام کو تقدیر کا درس دے کر رضائے الٰہی پر راضی رہنے کی تلقین کرتے رہے۔

دوسرا مسئلہ جو زبان زدِ عام ہے یہ ہے کہ ''لوحِ محفوظ'' کو ایک ایسی تختی سمجھ لیا گیا جس میں قیامت تک ہونے والے ہر چھوٹے بڑے واقعے اور ہر نیک و بد امر کا ریکارڈ پہلے سے موجود ہے۔ یعنی تقدیر کا لکھا جسے اس لوح سے جسے لوحِ محفوظ کہا جاتا ہے، مٹایا نہیں جا سکتا۔ یہ تصور درست نہیں ''لوحِ محفوظ'' کی ترکیب قران مجید میں صرف ایک ہی جگہ آئی ہے، صرف قرآن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ○ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (85:21-22)

نہیں بلکہ یہ کتاب (جس کے ذریعے بندوں کے لیے ہدایت نازل ہوئی ہے) قرآنِ مجید ہے (ایک عظیم الشان) بار بار پڑھی جانے والی کتاب (اور اس کی ایک اور شان یہ ہے کہ) یہ لوحِ محفوظ میں ہے۔ (یہ کتاب کبھی نہ مٹنے والی ہے، ہر تبدیلی اور آلائش سے محفوظ۔ دوسری جگہ فرمایا کہ: اسے محفوظ رکھنا ہماری ذمہ داری ہے)

دیگر مقامات پر بار بار ''الکتاب'' کا تذکرہ ہے۔ جس طرح قرآن بہ طورِ کتاب، قوانینِ ہدایت پر مشتمل ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قوانینِ فطرت کو بھی الکتاب کہا ہے۔ الکتاب، اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانینِ فطرت کا دوسرا نام ہے۔ انھی قوانین کے تحت کائنات میں سب کچھ ہوتا ہے۔ ان قوانینِ قدرت کو اس طرح وضع کیا گیا ہے کہ ان میں امکانات کی ایک وسیع دنیا آباد ہے۔ مثال کے طور پر اوپر سے نیچے گرنے والی ہر شے کششِ ثقل کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس شے کا حجم اور پھیلاؤ، فضا کی کثافت، ہوا کی رفتار، اس شے کا کسی قوت کے ساتھ پھینکا جانا یا از خود گرنا۔۔۔ یہ سبھی کچھ قوانینِ فطرت کا پابند ہے۔ ان تمام مقامی اور لمحاتی تبدیلیوں کو ہم ان امکانات میں شمار کرتے ہیں جو الکتاب یعنی قوانینِ فطرت میں پہلے سے مضمر

Marfat.com

ہیں۔ ان امکانات کا نسبت و تناسب الکتاب میں موجود ہے نہ کہ ہر ہر حرکت!

انسان کے چلنے دوڑنے بھاگنے کو ہی لے لیں۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے اس کی ٹانگوں کی خاص ساخت مقرر کی، جوڑ اور پٹھے بنائے، ایک خاص لمبائی طے کر دی۔ پھر ان میں دورانِ خون کے ذریعے زندگی اور توانائی فراہم کی۔ ایک مکمل اعصابی نظام کے ذریعے ہلنے جلنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت عطا ہوئی۔ اس ٹانگ کا تعلق اعصابی نظام (ریڑھ کی ہڈی اور دماغ) سے جوڑا گیا۔ اس طرح قوانینِ فطرت کے تحت ٹانگ کو ایک خاص اندازے پر تخلیق کیا گیا۔ پھر ایک اور قانون درمیان میں آ گیا۔۔۔ انسان کا ارادہ اور اس کا اختیار۔ اس پر پھر ایک اور پابندی لگا دی گئی یعنی زمین کی کششِ ثقل کہ ایک خاص حد تک ان ٹانگوں سے اچھلا اور دوڑا جا سکتا ہے، پھر ان کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ یہ سارا نظام قوانینِ فطرت کے تحت، الکتاب کے تابع ہے۔ تاہم ٹانگوں کی ہر ہر حرکت اور انسان کے ہر ہر احساس اور تجربے کا ریکارڈ پہلے سے الکتاب کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا۔ ہاں البتہ انسانوں کے ہر ہر عمل کا پورا ریکارڈ رکھا جا رہا ہے اور اسے امامِ مبین کا نام دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ ضرور بتا دیا ہے کہ اس کے بنائے ہوئے اس ریکارڈ روم کے دو حصے ہیں، علیّین اور سجّین جن میں ہر شخص کے نیک و بد اعمال و افعال کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں امامِ مبین اور کتابِ مبین کے حوالے سے متعدّد آیات میں بالتفصیل یہ بتا دیا گیا ہے:

1 اللہ تعالیٰ زمین و آسمان میں موجود ہر شے اور اس کی ہر حرکت کا علم رکھتا ہے۔

2 اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصی انتظام کر رکھا ہے کہ ہر شخص کے نیک و بد افعال کا مکمل ریکارڈ، کتابٌ مرقوم (لکھی ہوئی کتاب) میں رکھا جائے۔

3 ہر مخلوق کا ہر عمل صحیفۂ فطرت، قوانینِ الٰہی کے تحت ہو رہا ہے۔ (اِلّا ماشاءَ اللہ)

یہی ہر شے کی تقدیر ہے اور پھر ہر مخلوق بالخصوص انسان نہ صرف یہ کہ اپنی مادّی زندگی میں اپنے جسد کو بخشی گئی صلاحیتوں کے مطابق، اپنی مرضی سے چل پھر، کھا پی اور لکھ پڑھ سکتا ہے بلکہ اپنے ارادہ و اختیار کو کام میں لا کر، نیک و بد میں تمیز کرتے ہوئے اعمالِ حسنہ بھی انجام دے سکتا ہے اور افعالِ سیّئہ بھی۔ عیاں ہے کہ اگر امتحان کی اس گھڑی میں انسان اپنے اعضا و جوارح کو اپنی مرضی سے حرکت نہیں دے سکتا اور اپنے ارادہ و اختیار کی صلاحیّت کو بروئے کار

Marfat.com

نہیں لاسکتا تو اسے اپنے افعال کا مکلف کیوں کر ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

✿✿✿✿

یہ بات زبان زدِ عام ہے کہ...... ''دعا تقدیر کو بدل دیتی ہے''...... یقیناً بدل دیتی ہے، مگر ان معنوں میں نہیں کہ کسی انسان نے دعا کی اور یکایک اللہ کی رحمت نے جوش میں آ کر قوانینِ فطرت کی بنیاد پر پہلے سے طے شدہ کسی امر کو منسوخ یا معطّل کر کے مستقبل کی صورتِ حال کو بدل ڈالا۔ بلکہ اصل بات کچھ اور ہے اور اس کے لیے ہمیں دعا کی کیفیت کو پوری طرح سمجھنا ہوگا۔

دعا کے بارے میں پہلی توجہ طلب بات یہ ہے کہ قرآنِ پاک میں مذکور تمام دعاؤں میں اور نبی اکرم ﷺ سے مسنون صحیح دعاؤں میں جو شے اللہ تعالیٰ سے طلب کی جارہی ہے وہ ایمان کی پختگی، عملِ صالح کی توفیق اور طلبِ مغفرت ہے۔ کسی ایک بھی دعا کے الفاظ میں براہِ راست دنیاوی مفادات طلب کرنے کا تذکرہ نہیں ہے۔ مشہور دعا ''فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً'' سے مراد اللہ کی جانب سے اس کی رضا اور آخرت کی فلاح کا حصول ہے اسی لیے ''فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً'' سے مراد بھی دنیاوی زندگی میں ایمان اور ایسے عملِ صالح کی توفیق طلبی ہے جو آخرت کی منزلِ مراد پر پہنچا دینے والے ہوں...... حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا...... ''اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ'' کے الفاظ اپنی بے بسی کا اظہار اور اللہ کی عظمت وجلالت ہی کا بیان ہے۔ اِس حقیقتِ کبریٰ کی تفہیم کا اظہار ہے کہ اللہ ہی غنی اور مخلوق سب کی سب فقیر ہے، حاجت مند ہے۔ ہمیں اس دعا کے ذریعے یہ سلیقہ وقرینہ سمجھایا جارہا ہے کہ اگر دنیاوی شے کی طلب ہو تو بھی محض اللہ کی عظمت و جلالت کا بیان ہو، اپنی بے بسی کا اظہار ہو اور احسان مندی کا تذکرہ!

کئی قرآنی اور مسنون دعاؤں میں دِین کی ترویج کی راہ میں آنے والی مشکلات دور کرنے کی استدعا ہے، مانگنے والا...... سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کا ذکر بھی کرتا ہے اور اپنی ثابت قدمی کے تہیّے کا اظہار بھی۔ دعا کی ایک صورت یہ ہے کہ بندہ ذلّت وخواری اور بے کسی و بے چارگی کی زندگی سے اللہ کی پناہ چاہے یا ایسی شیطانی قوتوں سے بچاؤ کی بھیک مانگے جو بدحال اور گمراہ کر دینے والی ہیں۔ چنانچہ یہ تمام قرآنی اور مسنون دعائیں کسی بھی طرح براہِ راست دنیاوی طلب کے ضمن میں نہیں آتیں۔

دعا کے بارے میں دوسری اہم ترین بات یہ ہے کہ دعا درحقیقت کسی انسان کا اپنے آپ

Marfat.com

اور اپنے آقا و مولا سے اپنے آپ کو بدل ڈالنے کا عہد ہے...... پہلے سے طے کردہ کسی غلط راستے کی نسبت بہتر راستہ اپنا لینے کا عہد۔ اپنے ایمان و ایقان کو پختہ تر کر لینے کا عہد اور اپنی ذات سے زیادہ سے زیادہ اعمالِ حسنہ انجام دِلوانے کا عہد!!

جب ہم یہ بات اچھی طرح جان چکے ہیں کہ "تقدیرات" تو محض امکانات کی ایسی وسیع دنیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے سجا رکھا ہے کہ تو یہ بات بھی یقینی ہے کہ ہم پر ہی بہتر امکانات کو کھوجنے کی ذمہ داری بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے ہوئے ہم اپنی ذات سے اور اپنے مالک سے یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو بدلنے پر آمادہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ دِین اسلام کا ماخذ، قرآن...... هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے...... انسان کا سوچ بدل گیا، اس کے ارادے تبدیل ہو گئے تو جان لو کہ امکانات کی راہیں بھی بدل گئیں...... سمجھ لو کہ تقدیر بدل گئی۔

❁❁❁❁

Marfat.com

نبوت ورسالت بسلسلہِ قانونِ اِتمامِ حجت

مکتبِ فراہی کے وابستگان نے قانونِ اِتمامِ حجت کو ایک خاص شکل دے کر جہاد وقتال کے عمومی نقطۂ نظر کو ردّ کر دیا ہے۔ ان افکار کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی ہے کہ ہر رسول نبی ہوتا ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ انبیا کی دعوت قبول نہ کرنے پر اُمت کی شامت نہیں آتی، انبیا قتل بھی ہوتے رہے لیکن انبیا میں سے جو عظیم شخصیتیں رسالت کے منصب پر سرفراز ہوئیں ان کے ضمن میں اللہ کی سنت (یعنی قانون اِتمام حجت کے تقاضوں) کے تحت اس اُمت کی ہلاکت یقینی ہوجاتی ہے۔ ان اصحابِ علم کا کہنا ہے کہ اس میں دو استثنا ہیں ایک حضرت محمد ﷺ کی اُمت کے ضمن میں کہ ان پر عذاب نہیں آیا بلکہ انھیں مفتوح کیا گیا (قریش اور یہود کو حضور ﷺ کے ہاتھوں اور دیگر اقوام کو صحابہ کرامؓ کے ہاتھ سے) اور یہ جو احکامِ قتال قرآنِ حکیم میں نبی ﷺ کو دیے گئے ہیں، انھی پر ختم ہو گئے، ان احکامات اور دیگر بہت سے احکام میں نبی کے لیے تخصیص ہے، یہ احکامِ اُمت کے لیے عمومی نہیں۔ جاوید غامدی لکھتے ہیں:

> ”یہ قانون صرف ان لوگوں کے لیے خاص تھا جن پر رسول اللہ ﷺ نے براہ راست اتمام حجت کیا۔“ (اسلامی علوم کے اساسی مسائل، صفحہ 17)

دوسرا استثنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں ہوا ان کی اُمت نے انھیں ردّ کر دیا لیکن یہود ہلاک نہیں کیے گئے۔ اب چونکہ سنتُ اللہ نہیں بدلتی اس لیے یہ ضروری ہے کہ بحیثیتِ رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ روئے زمین پر آئیں اور یہود کو اپنے ہاتھوں سے یہ سزا دیں۔ کچھ وابستگانِ مکتبِ فراہی یہ سمجھتے ہیں کہ یہود اصلاً توحید پر قائم تھے (یہ ایک مغالطہ ہے) اس لیے انھیں قیامت تک کے لیے مغلوب رہنے کی سزا دے کر عذاب ٹال دیا گیا۔ (حالانکہ یہ بھی غلط

Marfat.com

فہمی ہے، یہود نے علمی اقتصادی اور سیاسی ہر میدان میں اپنی برتری ثابت کر دی ہے اور قرآن کے الفاظ اُسی گذشتہ دور کے لیے ہیں) اس طرح قانونِ اتمامِ حجت کی ان تفسیرات نے دو نظریات کو تقویت دی ہے۔ ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول قبل از قیامت کے نظریے کو اور دوسرے یہ کہ اُمتِ مسلمہ سے قتال کی ذمہ داری اٹھا لی گئی۔ بنیاد اس سارے نظریے کی محض اس مفروضے پر ہے کہ نبوت پہلے درجے کی عمومی ذمہ داری ہے جبکہ رسالت ایک بہت عظیم منصب ہے جسے اللہ اپنی سنت کے ذریعے نافذ کرتا ہے۔

سب سے پہلے ہم نبوت اور رسالت کے اس فرق پر بحث کریں گے۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مبین میں رسول کی اصطلاح فرستادہ، پیامبر، بھیجے جانے والے کے لیے استعمال کی ہے چنانچہ انسانوں کے ساتھ ساتھ یہ اصطلاح ان ملائکہ کے لیے بھی استعمال کی گئی جنھیں انسانوں کی طرف بھیجا جاتا ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ (31:51)

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ الْمُرْسَلُوْنَ (61:15)

بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ (80:43)

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (61:6)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا (1:35)

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (75:22)

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ (81:11)

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ (20-19:81)

ان چند آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسالت اس طرح کا عظیم منصب نہیں جیسا کہ مکتبِ فراہی کے اصحابِ علم نے بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ ہر فرستادہ کے لیے رسول کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ۔ (43:6) ''اور ہم نے پہلے لوگوں میں بہت سے نبی بھیجے''۔ گویا تمام انبیا کی رسالت کا، انھیں بھیجے جانے کا ذکر ہوا ہے۔

قرآنِ حکیم اس سلسلۂ ہدایت کے آخری رسول کو خاتم النبیین کہتا ہے اور حدیثِ مبارکہ

Marfat.com

میں ارشاد ہوا...... لا نبیَ بعدی۔ جن عظیم شخصیات کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایات کے لیے ارسال فرمایا انھیں ''نبوت'' کے عظیم الشان مرتبے پر سرفراز فرمایا گیا۔ اس معاملے کی وضاحت کے لیے ہمیں ''نبی'' کے اصل معنی سمجھنے ہوں گے۔

قاضی محمد اعلیٰ تھانوی اپنی تصنیف کشّاف اصطلاحات الفنون میں لکھتے ہیں:

النبی هو لفظ منقول فی عرف الشرع عن معناه اللغوی فقیل هو فی اللغة المُنبِئ من النباء سُمّی به لانبائه عن الله تعالیٰ فهو حینئذ فعیل بمعنی فاعل۔

''النّبی ایسا لفظ ہے جو شرع یعنی دین کی معروف اصطلاح ہے اور لغوی معنوں میں مستعمل ہے۔ پس النّبی لغت کے لحاظ سے النباء (خبر، تنبیہہ) سے المنبّی (متنبہ کرنے والا) ہے۔ اسے یہ نام اللہ کی جانب سے ملنے والی خبر کی بنیاد پر ملا ہے پس وہ فعیل بمعنی فاعل کے ہے۔''

ان الفاظ سے عیاں ہے کہ نبی کے معنی ''خبر دینے والے'' کے ہیں۔

فقال اهل الحق من الاشاعرة هو (النبی) من قال الله تعالیٰ له: ممن اصطفاه من عباده او ارسلناك الی قوم كذا والی الناس جمیعاً او بلّغهم عنّی۔ (الجزء الثّانی، ص1358)

''اشاعرہ میں سے اہل حق نے کہا ہے کہ النّبی وہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہو، ان انسانوں میں سے ہو کہ جسے اللہ نے منتخب کیا ہے یا یہ کہا کہ اسے فلاں قوم کی طرف بھیجا یا اسی طرح تمام انسانوں کی طرف یا کہا کہ انھیں میری طرف سے پہنچا دو''۔

اس طرح تھانوی صاحب نے قرآن کے حوالے دے کر یہ وضاحت کر دی کہ وہ شخصیت جسے انسانوں کی جانب بھیجا گیا ہو (یعنی رسول) اُسے اس کے اصل منصب یعنی انسانوں کو اللہ کا پیغام دینے، انھیں خبر دار کرنے، شاہد (اعلانِ حق کرنے والا) اور نذیر و بشیر ہونے کی بنا پر ''نبی'' کہا جاتا ہے۔ نبی کا اصل کام ''انذار'' ہے جیسا کہ فرمایا: نَبِئ ء عبادی (49:15)۔ میرے بندوں کو خبردار کردو۔

Marfat.com

"النبی" کا لفظ کسی غیر نبی کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ یہ قرآن کا فیصلہ ہے لیکن اعدائے دین نے فلسفہ اور تصوف کی آڑ میں منصبِ نبوت کو پامال کر دیا۔ خود تھانوی صاحب لکھتے ہیں:

وقال الفلاسفة ای فلاسفة الشريعة هو (النبی) من اجتمع فيه خواص ثلاث۔ الاول: ان يكون له اطلاع علی مغيبات الكائنة والماضية والاتية ...والثانی ظهور الافعال الخارقة للعادة ...والثالث ان يری الملائكة مصوّرة بصورٍ محسوسة ويسمع كلامهم وحيا من الله اليه...

اور فلاسفہ نے کہا ہے یعنی شریعت سے بحث کرنے والے فلاسفہ نے کہ النبی وہ ہے جس میں تین خواص جمع ہوں۔ اوّل: کہ اسے کائنات کے اور ماضی کے اور حال کے پوشیدہ اُمور کی اطلاع دی گئی ہو اور دوم: عادت کے خلاف، خارقِ عادت امور کا ظاہر ہونا اور سوم: کہ وہ ملائکہ کو ایسی صورت میں دیکھے جو محسوس کی جاسکتی ہو اور ملائکہ کا کلام سنے جو اس نبی تک اللہ کی جانب سے وحی کیا گیا ہے"۔

عیاں ہے کہ فلاسفہ نے النبی کے جو معنے بتائے ہیں ان کے لیے قرآنِ حکیم سے کوئی دلیل نہیں مل سکتی (خصوصاً غیب کا معاملہ) بلکہ اس کے قطعاً برعکس یوں طے پایا کہ جن شخصیات کو انباءِ غیب ملتی ہیں، جو غیب کی اطلاعات دے سکتے ہیں اور جن کے پاس ملائکہ آتے رہے یا آئیں گے وہ سب اس تعریف کی رو سے نبی ہیں۔ اسی باعث علما کے درمیان یہ بحث جاری ہے کہ حضرت مریم] بھی نبیہ تھیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ نبی کے درجے کو اس درجہ گرادیا گیا کہ اُمت کے چیدہ افراد کو بھی نبی بلکہ اس سے بالاتر (بزعم خود) ایک اعلیٰ منصب "ولایت" پر سرفراز کر دیا گیا۔

صاحبِ کشاف اصطلاحات الفنون مزید لکھتے ہیں۔ (خلاصہ پیشِ نظر ہے):

الولی کے معنی ہیں المتصرف فی امرِہٖ، المعین، الناصر اور المعتق۔ معاشرتی اُمور کے لحاظ سے یہ اصطلاحات عام افراد کے لیے بھی استعمال ہوسکتی ہیں تاہم دینی اُمور اور بالخصوص تکوینی اُمور کے لیے یہ صفاتِ باری ہیں جنھیں فلاسفہ اور صوفیا نے غوث، قطب، ابدال جیسے

Marfat.com

مزعومہ اولیا کے لیے بھی مخصوص کر دیا ہے۔ تھانوی صاحب مزید لکھتے ہیں:

وفی الشرح العقیدۃ الفارضیۃ واما الولایۃ فھی التصرّف فی الخلق بالحق فلیست فی الحقیقۃ الا باطن النبوۃ لان النبوۃ ظاھرھا الا نباء وباطنھا التصرف فی النفوس باجراء الاحکام علیھا والنبوۃ مختومۃ من حیث الانبیاء ای الاخبار اذ لا نبی بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم دائمۃ من حیث الولایۃ والتصرف لان نفوس الاولیاء من امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم حملتہ تصرف ولایۃ یتصرف لھم فی الخلق بالحق الی قیام الساعۃ فباب الولایۃ مفتوح وباب النبوۃ مسدود۔ (ص1529)

''اور شرح عقیدہ فارضیہ میں بیان ہوا ہے کہ ولایت نام ہے مخلوق کے اُمور میں حق تعالیٰ کے ساتھ تصرّف کا اہل ہونا اور فی الحقیقت یہی نبوت کا باطن ہے کیونکہ نبوت کا ظاہر خبر دینے میں ہے اور نبوت کا باطن (یعنی ولایت) انسانوں کے اُمور میں تصرّف میں ہے اور نبوت ختم کر دی گئی ہے اور نبی نہیں آئیں گے کیونکہ محمد ﷺ کے بعد ولایت اور تصرف کے لحاظ سے نبی نہیں آئیں گے اور محمد ﷺ کی اُمت کے اَولیا میں حق تعالیٰ کے ساتھ ساتھ (اولیاء اللہ کا) تصرّف تا قیام قیامت جاری رہے گا۔ پس ولایت کا (یعنی نبوت کے باطن کا) دروازہ کھلا ہے اور نبوت کا دروازہ بند ہے''۔

اس طرح اہلِ تصوف نے پہلے تو ولایت کو نبوت کا ایک درجہ شمار کیا پھر ولایت کے لیے تکوینی اُمور مختص کر کے اسے اعلیٰ رتبے پر فائز کر دیا اور تا قیامت ولایت کے دروازے کھول دیے تا کہ ہما شما ولی ہونے کا دعویٰ کر کے خود کو انبیا سے بڑھ کر اُمورِ کائنات میں متصرّف ہونے کا دعویٰ دار بن جائے۔ اغلباً اسی دعویٰ کے اثبات کے لیے ایک حدیث بھی گھڑ لی گئی: ''علما امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔'' ایک اور حدیث بھی مقبول ہے: من صلی خلف عالم تقی فکانما صلی خلف النبی۔ (جس نے کسی متقی عالم کے پیچھے نماز پڑھی گویا کہ اس نے نبی کے پیچھے نماز ادا کی)۔

Marfat.com

ولایت کا مختصر فلسفہ مزید تشریح کا محتاج تھا اور یہ کمی بھی تھانوی صاحب نے درج ذیل ارشادات کے ذریعے بخیر و خوبی پوری کر دی ہے۔ (ان کا انکار بھی اصرار سے بڑھ کر ہے):

وما قیل ان الولایة افضل من النبوة لا یصح مطلقاً الا بقیدٍ وھو ان ولایة النبی افضل من نبوته التشریعیة لان نبوة التشریع متعلقه بمصلحة الوقت والولایة لا تعلق لھا بوقت دون آخر بل قام سلطانھا الی قیام الساعة ایضاً النبوة صفة الخلق دون الحق والولایة صفة الحق ولذا یطلق علیه اسم الولی دون النبی ۔(ص 1529)

''اور یہ جو کہا گیا ہے کہ ولایت، نبوت سے افضل ہے تو یہ بات بغیر شرط کے درست نہیں ہے مگر ایک شرط کے ساتھ کہ ایک نبی کی ولایت، اس کی شرع پر مبنی نبوت سے افضل ہوتی ہے کیونکہ شرع پر مبنی نبوت وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوا کرتی ہے جبکہ ولایت کا کسی دور سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، آخرت سے پہلے......! بلکہ ولایت کی قوت کی پہنچ قیامت کے آنے تک قائم رہتی ہے۔ اس کے علاوہ نبوت، مخلوق کی صفات میں سے ایک صفت ہے یعنی حق تعالیٰ کی ذات سے ادھر ادھر جبکہ ولایت حق تعالیٰ کی صفت ہے اسی باعث اللہ کی ذات پر ولی کے نام کا اطلاق ہو جاتا ہے مگر نبی کے نام کا اطلاق اللہ کی ذات پر نہیں ہوتا۔''

ان ارشاداتِ عالیہ کی روشنی میں مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ کس طرح منصبِ نبوت و رسالت اور ولایت سے فروتر کر کے عام افرادِ اُمت کے لیے قابلِ حصول بنا دیا گیا۔ صاحبِ کشاف اصطلاحات الفنون اہلِ تصوف کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں:

و فی اسرار الفاتحة النّبی ھوالّذی یریٰ من المنام ۔(الجزء الاوّل، ص584)

(اور اسرار الفاتحہ میں لکھا ہے کہ نبی وہ ہے جو خواب کی حالت میں اسرارِ حق کو دیکھتا ہے۔)

اسی فکر اسی قول کو تقویت بخشنے کے لیے ایک حدیث بھی وضع کر لی گئی: لن یبق من النبوة

Marfat.com

الا المبشرات۔ مقصد یہ کہ اہلِ کشف (بزعم خود) اپنے آپ کو انباءِ غیب سے ہر وقت مطلع رہنے کی خصوصیت کی بنا پر ولایت کے درجے پر فائز تصور فرمائیں اور ان کے قلب کے نہاں خانوں میں یہ عقیدہ موجود ہو کہ ولایت کا درجہ (اپنے تکوینی تصرّفات سمیت) درجۂ نبوت سے افضل ہے۔

❁❁❁❁

ماہرینِ لغتِ قرآن میں یہ مرض عام ہے کہ وہ ہر قرآنی اصطلاح کے ایک سے زیادہ معانی لکھ دیتے ہیں حالانکہ عربی زبان اتنی یتیم نہیں کہ صفات اور خصوصیات کے بدلنے پر ہمیں اس زبان کے الگ الفاظ دستیاب نہ ہوں۔ یہ ایک انتہائی اہم معاملہ ہے جس پر راقم الحروف نے ریسرچ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عجمیُ الاصل مصنّفین نے عربی اصطلاحات کے درست مترادفات کے بجائے ایک ایک لفظ کے متعدّد معانی لکھ کر اپنی کم مائیگی کا ثبوت دیا ہے، قرآن کے معانی کو خبط کرنے (روند دینے) میں مددگار ثابت ہوئے ہیں اور تفسیر بالرّائے کی راہ ہموار کر دی ہے۔ اس نوع کی دو تین مثالیں درج ذیل ہیں جن سے ذہنی کج روی عیاں ہے۔

بعض اصحاب کا کہنا ہے کہ لفظ نبی کا تعلق النَّبوَۃ سے ہے جس کے معنی ٹیلا یعنی بلندی کے ہیں۔ النّبی جو مقام بلند پر فائز ہو۔ مگر یہ معنی اپنے مصدر کے حساب سے درست نہیں اور اگر ان معانی کو کسی حد تک درست مانا جا سکتا ہے تو اسی تاویل کے ساتھ کہ نبی پکارنے والا ہے جو بلند مقام سے پکارتا ہے۔

محمد بن ابوبکر الرّازی (المتوفّی بعد 691ھ) مختارُ الصّحاح میں لکھتے ہیں:

نبأ الشي عنه: تجافي وتباعد. انباه: دفعه عن نفسه۔ (ص 671)

اس نے کوئی شے بتائی: اپنے سے الگ کیا، دور کیا۔۔۔ یعنی دوسروں تک پہنچا دیا۔ اور انباہ کے بھی یہی معنی ہیں کہ اپنی ذات سے دور کر دیا۔

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ ''النّبی'' وہ ہے جو آگے کوئی خبر دے لیکن ازاں بعد النّبی کے معنی فعیل بمعنی فاعل کی بجائے فعیل بمعنی مفعول کو ترجیح دیتے ہیں۔ (یعنی النّبی وہ ہے جسے خبر دی جائے)۔

انھی کی طرح معجم مفردات الفاظ القرآن میں علامہ الراغب الاصفہانی ایک ہی حقیقی معنی پر اکتفا نہیں کرتے۔ انتہائی مناسب خوبصورت الفاظ میں النّبی کے درست معنی اس طرح لکھتے ہیں:

Marfat.com

والنبوة سفارة بين الله وبين ذوی العقول من عبادہ لازاحة علتهم فی امر معادهم۔ والنبی لکونه منبابما تسکن الیه العقول الذکیة وهو یصح ان یکون فعیلا بمعنی فاعل لقوله تعالیٰ...نَبِّئْ عِبَادِی ...قُلْ ءَأُونَبِّئُكُمْ۔(ص 501)

''اور نبوت، سفارت یعنی پیغام رسانی کا نام ہے، اللہ اور اللہ کے بندوں میں سے عقل رکھنے والی جنسوں (العالمین، اِنس وجنّ) کے درمیان تا کہ ان کے آخرت کے اُمور میں سے اُن کے مرض ان سے دور کر دیں اور نبی اپنی ذات میں ایسا خبر دار کرنے والا ہے کہ ذی فہم وعقل اس سے خبر پا کر سکون حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ لفظ نبی فعیل یعنی فاعل کے وزن پر ہے جیسا کہ اللہ نے نبی سے فرمایا: آپ میرے بندوں کو خبر دار کریں اور نبی نے فرمایا: کہو کیا میں تمھیں خبر دار کروں''۔

لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس کے بعد راغب اصفہانی نے النّبی کی واضح ساخت بمعنی فاعل کو پسِ پشت ڈال کر محض نباء کے بطورِ فعل استعمال سے النّبی کو مفعول کیسے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ فرماتے ہیں:

وان یکون بمعنی المفعول لقوله: نبانی العلیم الخبیر۔

''اور نبی کے معنی ہیں کہ جیسا کہا اللہ نے کہا: (اے نبی کہہ دیں) علیم و خبر اللہ نے مجھے خبر دی''۔

عیاں ہے کہ راغب اصفہانی (المتوفّٰی 486ھ) نے آغازِ کار میں جو مظاہرہ تفسیر بالرّائے کا کیا ہے اس سے سبھی آنے والے بالخصوص قرآنِ حکیم کے وہ تمام اوّلین مفسرینِ کرام جو خود بھی عجمی اُلنّسل تھے، پوری طرح متاثر ہوئے۔ اسی انتشارِ معانی کا پورا پورا فائدہ فلاسفہ اور اہلِ تصوف نے اٹھایا اور اپنے کشف کو اخبارِ نبوت سے بڑھ کر اہم اور لائق اعتبار گردانتے رہے۔

✿✿✿✿

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انبیا پر رسولوں کی برتری جتانے کے لیے جو دلائل دیے جا سکتے ہیں ان کی کیا حیثیت ہے۔ ہم یہ ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیا کو ان کے فرستادہ

Marfat.com

ہونے کے سبب رسول قرار دیا ہے۔ارشاد ہے:

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا (44:23)

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا (27:57)

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (35:16)

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (47:10)

اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام منتخب داعیانِ حق کو ایمانیات خمسہ میں نبی بھی کہا ہے اور رسول بھی:

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (285:2)

ایمانیاتِ خمسہ میں کبھی رُسُل کہا، کبھی نبیین۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ

(177:2)

اس کے باوجود بعض اصحابِ علم کو اس بات پر اصرار ہے کہ انبیا تو قتل بھی ہوتے رہے لیکن رسول ہمیشہ کامیاب ہوئے اور اس کی تائید میں یہ آیت پیش کرتے ہیں: لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ۔ (21:58) سورۃ المجادلہ میں اللہ تعالیٰ نے يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا (اس دن اللہ ان سب کو اُٹھائے گا) سے بات شروع کر کے آخر سورۃ میں حزبُ اللہ کا تذکرہ فرمایا اور یہ کہ حزبُ اللہ کے لیے جنت کی ابدی زندگی ہے۔اس آیۂ مبارکہ سے پہلے حزبُ الشیطان کا تذکرہ کرتے ہوئے اس گروہ کے جہنّم رسید ہونے کا ذکر فرمایا: اُولٰٓئِكَ فِى الْاَذَلِّيْنَ (یہ لوگ بہت ذلیل وخوار ہونے والوں میں سے ہیں)۔

چنانچہ پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جس غلبے کا اس آیت میں ذکر ہے وہ یومِ حساب اور اس کے بعد کا غلبہ ہے۔رسول اور نبی میں کوئی فرق نہیں، جنھیں اس منصبِ نبوت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے انھیں اللہ کے پیغام بر ہونے کی بنا پر رسول کہا جاتا ہے۔تاہم سورۃ النجم کی ایک آیۂ مبارک میں جسے غلط طور پر آیۂ غرانیق کا نام دے دیا گیا ہے، رسول اور نبی، دونوں الفاظ ایک ہی آیت (52:22) میں آجانے کے سبب مغالطہ پیدا ہونا ممکن ہے۔ علامہ سیوطی نے ''اسبابِ نزولِ قرآن'' میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ایک لایعنی روایت کی تائید کے لیے الفاظ کے معنے ہی بدل دیے۔فرماتے ہیں:

Marfat.com

تمنّی: قراء وتلا کتاب اللہ۔ (حالانکہ تمنی کا معنی پڑھنا نہیں بلکہ اس کا معنی ہے: تمنا، آرزو، خواہش) فی امنتیہ: فی الآیات التی یتلوھا۔ (یہ معنی لغت عرب سے متصادم ہے)

اس اجمال کی تفصیل صاحبِ کشّاف علامہ زمخشری نے اس طرح بیان کی ہے:

انّ النّبی صلّی اللہ علیہ وسلم کان بمکۃ فقراء سورۃ النّجم حتّٰی انتھیٰ الی قولہ تعالیٰ: افرء یتم اللات والعزّیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ فجری علیٰ لسانہ: الغرانیق العلی۔ الشفاعۃ منھا ترتجی۔

یہ کہ نبی ﷺ مکّہ میں تھے جب آپ نے سورۂ النجم کی تلاوت کی یہاں تک کہ آپ اللہ تعالیٰ کے اس قول تک پہنچے: ''کیا تم نے دیکھا ہے لات اور عزّیٰ کو اور تیسرے بعد والے (بت) منات کو......تب آپ ﷺ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے: ''یہ بلند مرتبہ خوبصورت (دیوی دیوتا) اِن سے شفاعت کی اُمید رکھی جاتی ہے''۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ مشرکین یہ سن کر خوش ہوئے اور جب نبی کریم ﷺ سجدہ میں گئے تو مشرکین نے بھی ساتھ ہی سجدہ کر دیا لیکن حضور ﷺ کی یہ تمنّا کہ کسی طرح مشرکین خوش ہو جائیں اور جس آمادگی کے باعث شیطان نے غلط الفاظ وحیِ الٰہی میں شامل کر دیے، اللہ کو پسند نہ آئی چنانچہ اللہ نے القاءِ شیطانی کو منسوخ کر دیا اور اپنی آیات کو محکم کر دیا۔ اس داستان کا کوئی سر پیر نہیں لیکن مفسرین اسے پورے یقین کے ساتھ نقل فرماتے ہیں۔

کچھ ایسا ہی معاملہ ان جھوٹی روایات کا ہے جو رسول کا نبی سے فرق ظاہر کرنے کے لیے تفاسیر میں درج کی گئی ہیں۔ علامہ زمخشری سورۂ الحج کی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

من رسول ولا نبیٍ: دلیل بین علی تغایر الرسول والنّبی۔

''اس ایک ہی آیت میں رسول اور نبی کے الفاظ ایک ساتھ آنے کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اور نبی کے اوصاف اور احکام میں فرق ہے۔''

اس کے بعد ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ سے پوچھا گیا انبیا کے بارے میں تو آپ نے فرمایا کہ ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ پھر پوچھا گیا کہ ان میں سے رسول کتنے ہیں تو ارشاد ہوا: ثلث مائۃ وثلاثۃ عشر جماً غفیراً۔ یہ بھی نقل ہوا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ رسولوں کی تعداد بھی انبیا کے برابر ہے (قال مثلہ) یہ روایات قطعاً ناقابل

Marfat.com

اعتبار ہیں۔ ان کی اسناد کمزور ہیں۔ علامہ ابن الجوزی نے ان میں سے بعض کو موضوعات میں رکھا ہے اور مسند احمد وغیرہ کتب حدیث تو ویسے ہی مشکوک ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس آیۂ مبارکہ کا معنی کسی اور طرح ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (52:22)

اس آیۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے پیغام کو اللہ کے بندوں کے درمیان مقبول کرنے کے پروگرام اور اس کی کامیابی کی تمنا کا تذکرہ ہے۔ یہ پیغام اللہ کے رسول (ملائکہ) انبیاء تک لے کر آتے ہیں اور سب اس پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ شیطان اس راہ میں روڑے اٹکاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے علم اور حکمت کے ساتھ شیطان کی کارروائیوں کو کالعدم کر دیتا ہے اور اپنی بھیجی ہوئی وحی، اپنی آیات کو استحکام بخشتا ہے۔ بنابریں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے بھیجے ہوئے تمام رسول منصب نبوت پر سرفراز ہوئے اور سابقہ اقوام کو سزا ملنے میں اس بات کا کوئی مذکور نہیں ہونا چاہیے کہ یہ ہلاکتیں چیدہ چیدہ رسولوں کی تکذیب کا نتیجہ تھیں۔

امام حمید الدّین فراہی رحمہ اللہ اپنی کتاب حقیقتِ دین میں لکھتے ہیں: ''پھر جب پیغمبر پر وحی آنے لگتی ہے اور وہ منصبِ نبوت پر سرفراز ہو جاتا ہے......'' (ص 36)

اس سے پہلے فرماتے ہیں: ''نبی کا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اسی لیے آپ قرآن مجید میں دیکھتے ہیں کہ رسالت کے بدل کے طور پر آیا ہے''۔ (ص 33)

امام فراہی نے ایک درست بات کو غلط بات کے ساتھ خلط کر دیا ہے یعنی تمام نبی رسول ہیں، درست ہے لیکن دوسری بات درست نہیں اور حقیقت یہی ہے کہ نبی کا منصب رسالت سے بڑھ کر ہے۔ صرف پیغام پہنچا دینا نہیں بلکہ اس کی تبیین و تفہیم، تعلیم کتاب و حکمت، تزکیہ نفوس اور انذار و تبشیر، اعلان حق۔۔۔ نبی یہ ساری ذمہ داریاں پوری کرتا ہے۔

✿✿✿✿

دعوتِ حق کی تکذیب پر قوموں کی ہلاکت کا الٰہیاتی قاعدہ انسانوں کے سوچے ہوئے کسی قانون کا پابند نہیں۔ ملاحظہ ہوں قرآنِ حکیم سے چند ارشادات:

Marfat.com

1 ذوالقرنین کے بارے میں بیشتر مفسرین کا یہی خیال ہے کہ وہ نبی نہیں تھے۔ (سائرس اعظم تھے)۔ اب ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِمَّآ اَنۡ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنۡ تَتَّخِذَ فِيۡهِمۡ حُسۡنًا۔ (86:18) مفسرین کی رائے درست تسلیم کرلیں تو بھی عذاب ہونے یا نہ ہونے دونوں کا امکان ظاہر کیا گیا ہے۔

2 ہم سمجھتے ہیں کہ یاجوج ماجوج مفتوح ہوکر، مغلوب ہوکر ہلاک ہو گئے: وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرۡيَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَاۤ اَنَّهُمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ ○ حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتۡ يَاۡجُوۡجُ وَمَاۡجُوۡجُ وَهُمۡ مِّنۡ كُلِّ حَدَبٍ يَّنۡسِلُوۡنَ (96:21)

''اور لازم ہے جس بستی والوں کو ہم ہلاک کردیں وہ لوٹ کر نہیں آتے (یہ قانون اس قدر اٹل ہے کہ ہم نے بڑی طاقتور اقوام کو اپنے بندوں کے ہاتھوں ہلاک کر دیا) حتیٰ کہ (وہ وقت یاد کرو) جب یاجوج ماجوج (جیسی وحشی اور کثیر التعداد قوم) بھی مفتوح ہوگئی درانحالیکہ وہ ہر گھاٹی سے اترتے چلے آرہے تھے۔''......ذوالقرنین کے ہاتھوں ایک ایسی قوم ہلاک ہوئی جو دعوتِ حق ماننے کو تیار نہ تھی۔ لَّا يَكَادُوۡنَ يَفۡقَهُوۡنَ قَوۡلًا۔ (93:18) وہ کوئی......حق......بات سمجھنے کو تیار نہ تھے۔

اگر فتحت کے معنے غلبت نہ تسلیم کیے جائیں تب بھی واقعہ یہ ہے کہ اس سیلابِ بلا کو ایک بند کے پیچھے محصور کر دیا گیا جہاں انھیں شدید سردی اور قحط نے مار ڈالا......اور گزری ہوئی، طبعی موت یا عذاب کے ذریعے ہلاک ہونے والی اقوام کے بارے میں اللہ کا فیصلہ ہے: اَنھُم لایرجعون۔ اس بات کی کوئی تاریخی یا واقعاتی شہادت دستیاب نہیں کہ یاجوج ماجوج ہزار ہا سال سے کسی سدّ کے پیچھے مقید ہیں۔ رہی بات ذوالقرنین کے ان الفاظ کی کہ جب اللہ کا وعدہ آئے گا تو اس کو ریزہ ریزہ کر دے گا تو یہ الفاظ دل میں آنے والے کبر کو دفع کرنے کے لیے کہے گئے۔

3 سورۂ یٰسین میں دو رسولوں کی مسلسل تکذیب پر عذاب نہ آنے کا ذکر ہے۔ پھر تیسرا رسول بھی پہنچ گیا۔ پھر ایک نیک بندے کی شہادت کو بھی ردّ کر دیا گیا تب جا کر عذاب آیا۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ انطاکیہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کو بھیجا گیا تھا اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ان کے نبی ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں متردّد ہیں۔

4 افضل الانبیا اور خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

Marfat.com

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ (46:10)

اللہ تعالیٰ نے اس امکان کو ردّ نہیں کیا کہ حضور ﷺ کو اٹھا لیا جائے جبکہ قوم کو عذاب سے دو چار بھی نہ کیا گیا ہو۔

5 سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: محمد ﷺ تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے رسول گزر چکے ہیں۔ تو کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم پیٹھ پیچھے پھر جاؤ گے۔ (144:3) اس آیت میں رسول کے قتل کا امکان ظاہر کیا گیا ہے۔

6 دیگر انبیاءِ کرام کی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو (جو امام الانبیا بھی کہلائے) رسول بھی کہا گیا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کئی بار ہجرت بھی کی۔ آپ بابل کی حکومت کے ایک شہر فدان آرام سے (جہاں آپ پیدا ہوئے تھے) اپنے باپ آزر اور اہلِ شہر حتیٰ کہ بادشاہِ وقت سے مایوس ہو کر اور آگ میں پھینکے جانے کی سزا پانے کے بعد ہجرت کر کے اور کلدنین پہنچے۔ وہاں سے حران اور پھر ارضِ فلسطین پہنچے۔ یہاں سے بھی مایوس ہو کر شکیم (نابلس) سے ہوتے ہوئے مصر گئے۔ بادشاہ وقت اور اس کی قوم نے بھی آپ کی دعوت کو نہ سنا۔ انسانوں سے مایوس ہو کر آپ مکہ کی ارضِ غیر ذی ذرع میں گوشہ نشین ہوئے جہاں آدمی تھا نہ آدم زاد۔ بیوی اور بچے کو ویرانے میں چھوڑ کر واپس ارضِ فلسطین اور شام کی طرف پھرتے رہے پھر ایک بار مکۃ المکرمہ آ کر بیت اللہ کی تعمیر کی۔ آپ جہاں جہاں گئے دعوتِ حق کے منکرین کے کسی طرح کے عذاب سے دو چار ہونے کی کوئی خبر تاریخ میں نہیں پائی جاتی۔

7 ایک جگہ قوم کو عذاب دینے کے معاملے میں صراحتہً نبی کا نام لیا گیا ہے: (مکتب فراہی کے مولانا امین احسن اصلاحی نے اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے، دانستہ نبی کی بجائے رسول لکھ دیا ہے)۔ ''اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نبی بھیجا اس کے باشندوں کو مالی اور جسمانی مصائب سے آزمایا کہ وہ رجوع کریں۔ پھر ہم نے دکھ کو سکھ سے بدل دیا۔ یہاں تک کہ وہ پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ دکھ اور سکھ تو ہمارے باپ دادوں کو بھی پہنچے۔ پھر ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا (یعنی عذاب نے انھیں آن لیا) اور وہ اس کا کوئی گمان نہ رکھتے تھے۔'' (95-94:7)

8 قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ (اور

Marfat.com

بہت سے نبی تھے جن کے ساتھ مل کر کثیر تعداد میں اللہ والوں نے قتال کیا) نبی کے لیے قتال ثابت ہے۔

9 اور فرمایا یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ (65:8) ''اے نبی ﷺ مومنین کو قتال کے لیے آمادہ کرو''۔

دیگر مستثنیات بھی تلاش کی جاسکتی ہیں لیکن اصل بات وہی ہے جو خود قرآنِ حکیم نے پوری وضاحت سے بیان کر دی ہے: وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ۔ (47:10)

اس آیۂ مبارکہ میں چند باتیں واضح طور پر بیان ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ ہر قوم کی طرف بھیجے جانے والے داعیِ حق کو رسول کہا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر قوم کا فیصلہ ان کے احوال کے مطابق ہوتا ہے (قُضِیَ۔ معاملہ کسی حد تک پہنچایا، قُضِیَ علیھم ہوتا تو مار ڈالنے کے معنی نکلتے ہیں) یعنی ضروری نہیں کہ انھیں ہر طور عذاب دیا جائے۔ سب کو ہلاک کر دیا جائے چنانچہ اس آیۂ مبارکہ سے یہ طے پا گیا کہ ہر نبی فرستادہ ہونے کے بنا پر رسول بھی ہے۔ یہی بات اور بہتر طریقے سے ایک اور آیت کی تلاوت سے سمجھ آسکتی ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا (45:33)

حضرت محمد ﷺ کو ان کے حقیقی منصب ''النبی'' سے پکارا گیا اور یہ بتایا گیا کہ انھیں بھیجا گیا ہے (یعنی رسول بنایا گیا ہے تاکہ آپ بحیثیتِ نبی) اعلانِ حق فرمائیں، خوشخبری سنائیں اور (عذابِ آخرت سے) ڈرائیں۔

لگ بھگ ایک ہی مضمون کی چار آیات قرآنِ حکیم میں ایسی آئی ہیں جن میں نبیِ اکرم ﷺ کے اصل منصب (شاہد، مبشر اور نذیر) کی مزید تفصیل بیان ہوئی ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (164:3)

فرمایا کہ مومنین میں سے ایک فرستادہ (رسول) کو ان کے پاس بھیجا گیا اور اس نبی محترم کا کام یہ ہے کہ وہ انھیں اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے،

Marfat.com

ان کی پاکیزگی کا اہتمام کرتا ہے، انھیں قانونِ الٰہی سے اور حکمت سے (یعنی اللہ اور بندوں کے حقوق کے درمیان توازن قائم کرنے سے) آگاہ کرتا ہے...... یہ تمام اُمور اسی حکم کے تحت ہیں جس میں کہا گیا ہے: نَبِّئْ عبادی...... اے نبی میرے بندوں کو آگاہ کردو۔

نبی کا درست منصب بتاتے ہوئے سورۃ الاعراف میں ارشاد ہوا کہ یہ رسول، یہ ہمارا فرستادہ، نبی اُمّی ہے:

''وہ لوگ جو (ہمارے) رسول کی جو نبی اُمّی ہے اتباع کرتے ہیں، وہی جس کا ذکر وہ (اپنی کتابوں) تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں (وہ نبی) جو انھیں معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر طاری بوجھ اور طوق ان پر سے اتارتا ہے۔ پس جو لوگ اس (نبی) پر ایمان لائے اور جنھوں نے اس نبی کو قوت دی اور اس کی مدد کی اور اس نور (ہدایتِ قرآنی) کی پیروی کی جو اس (نبی) کے ساتھ اُتارا گیا ہے، تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں''۔(157:7)

اگرچہ انبیاء علیہم السلام تمام بشری تقاضوں کے ساتھ ایک انسان ہوتے ہیں تاہم ان میں اور عام انسانوں میں بہت سے فرق واضح ہیں جن کہ وجہ سے انبیا فضیلت میں نہایت برتر ہیں اور اسی سبب ایک نبی کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ اپنی اطاعت قرار دیتا ہے۔ مثال کے طور پر:

1 انبیا اعلیٰ حسب نسب کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کا ذاتی اوراک عالم و فاضل اشخاص سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے اور انھیں اللہ تعالیٰ حکمت عطا فرماتا ہے۔

2 انبیا کے بارے میں ارشاد ہوا کہ وہ اپنے ربّ کی جانب سے بَیِّنَۃ پر ہوتے ہیں یعنی ان کی فطرت میں دلیلِ ربانی مضمر ہوتی ہے ان کا ایمان ویقین کامل ہوتا ہے۔

3 انبیا کو ملکوت کے احوال دکھلا دیے جاتے ہیں، انھیں غیب سے ان اُمور کی واقفیت دی جاتی ہے جن سے عام انسان کبھی آگاہ نہیں ہوسکتا۔

4 انبیا کا رابطہ تدبیرِ امر کرنے والے یعنی امرِ تکوین اور امرِ ہدایت کے حامل ملائکہ سے کروایا

Marfat.com

جاتا ہے اور وہ عین الیقین کے علاوہ حق الیقین کے درجے پر فائز ہوتے ہیں۔

5 انبیاء علیہم السلام کی فطرت میں اعلیٰ ترین اقدارِ انسانیت سمو دی جاتی ہیں جن کے باعث وہ انسانیت کے رہبر و رہنما بن جاتے ہیں اور کبھی حق سے ادھر ادھر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔

✿✿✿✿

مکتبِ فراہی کے وابستگان ایک غلط خبر کے ذریعے شانِ نبوت کو فروتر کر رہے ہیں۔ قرآنِ حکیم سے محبت رکھنے والوں سے اس زیادتی کی توقع نہیں تھی۔ یہ مغالطہ آرائیاں اہل تشیّع کا نشانِ امتیاز ہیں۔ ابنِ عربی لکھتے ہیں:

''پس مقام نبوت ...... ولایت اور رسالت کا برزخ ہے۔ مقام ولایت اس سے بالاتر اور مقام رسالت فروتر ہے۔'' (فتوحاتِ مکیہ)

اور ایرانی مفکر محسن جہانگیری اپنی کتاب محی الدین ابنِ عربی میں لکھتے ہیں:

''ابن عربی نے اپنی تالیفات میں شیعہ اماموں کی روایات نقل کرنے کا اہتمام کیا۔ بعض مقامات پر ان کی ولایت کا بھی اعتراف کیا اور ان کے لیے انبیا کے مساوی مقام کے قائل ہیں۔'' (ص 564)

وحدۃ الوجودی تصوف کا منبع تشیّع ہے۔ اب اسے جس رنگ میں چاہے قبول کر لیں نتیجہ ایک ہی برآمد ہو گا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:

اوتی الانبیاء اسم النبوۃ و اوتینا اللقلب ای حجر علینا اسم النبی مع ان الحق یخبرنا فی سرائرنا بمعانی کلامه و لکلام رسوله ویسمی صاحب هذا المقام من انبیا واولیاء ۔(الیواقیت والجواهر 39، جزو 2)

مختصراً آپ فرماتے ہیں کہ ہمیں یعنی ہم اولیا کو رازہائے درونِ خانہ جاننے کے سبب انبیا کہا گیا ہے۔

سیّد سلیمان ندوی حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ نے حقیقت محمدیہ کے نظریے کو قبول کرتے ہوئے تشریعی نبوت اور غیر تشریعی یعنی تکوینی نبوت میں خطِ امتیاز کھینچا اور فرمایا کہ تشریعی

Marfat.com

نبوت ختم ہوئی، تکوینی کا امکان باقی ہے''۔

......اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اتباعِ سنت پر زور دیا مگر ساتھ ہی نبوت کی فلسفیانہ توضیح پیش فرمائی۔ اس کے ذریعے جو ضلالت پیش آئی وہ نبوت کی راہ سے تھی۔ اسی راہ سے انا النبیؑ اور انا المہدی کہنے والے پیدا ہوئے۔

(سیرتِ سلیمانی کا عرفانی پہلو۔ ص6)

یہ فکری کج آرائی کہاں سے طلوع ہوئی۔ ملاحظہ ہوں اسماعیلی نظریات:

''ہمارے ائمہِ معصومین کی شان انبیائے مرسلین کی شان سے بدرجہ بلند ہے۔ دونوں میں مالک اور مملوک کا فرق ہے۔'' (ص366)

''آپ (ابو طالب) کے بعد یہی چاروں مراتب (نبوت ورسالت اور وصایت وامامت) مولانا علی کی ذات میں جمع ہیں...... چنانچہ مستند امام مولانا علی ہی ہیں جن پر دلالت کرنے کے لیے آنحضرت بھیجے گئے۔ آپ نے جو آخری رسالت بہم پہنچائی وہ مولانا علی کی ولایت ہے۔'' (ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام، ڈاکٹر زاہد علی، ص360)

عبداللہ ابن سبا یہودی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہی نبوت محمدی کے مقابلے میں ولایت امامت اور وصایت کے گمراہ کن افکار کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔

بنا بریں ہم سمجھتے ہیں کہ شانِ نبوت کو گھٹانا اور ولایت وامامت کے نام پر مزعومہ اصحابِ کشف کو برتر ثابت کرنا، تفلسف اور متصوفین کا کام ہے۔ ایسے بے بنیاد دعاوی سے نبوت کو ارزاں کر کے ہما شما میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو بس اس داعی الی الحق کا منصب ہے جسے اللہ تعالیٰ جبرائیل امین کے ذریعے اپنی آیاتِ حکمت سے نوازتا ہے۔

✿✿✿✿

قادیانیت نے جہاد کو باطل قرار دیا اور ان سے پہلے سرسیّد احمد خان نے رواداری کے نام پر جہاد سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اب وابستگانِ مکتبِ فراہی کچھ نئے پرانے دلائل لا کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دعوتِ حق کو قبول نہ کرنے والوں کے خلاف تلوار کشی کا رویہ انسان دوستی، انسان پرستی سے متصادم ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ ''ناپسندیدہ کام'' محض ایک سنتِ الٰہی کو

Marfat.com

پورا کرنے کے لیے انجام دیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بنیادی نکتہ قتال کے بارے میں بیان کر دیا ہے اور چاہیے کہ اس ایک نکتے کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ۔ (193:2)

''فتنہ کے معنی کیا ہیں؟ اکثر مفسرین نے اس کے معنی شرک اور ظلم لکھے ہیں۔ لیکن مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ اس بات پر متفق ہیں کہ اس کے معنی ہیں: ''ظلم اور جبر کے ذریعے کسی کو اس کے دین کی راہ سے برگشتہ کرنا''...... یہی وہ کام ہے جو اہلِ مکہ نے کیا اور یہی وہ جبر ہے جو نیو ورلڈ آرڈر کے ذریعے مسلمانوں پر مسلط کیا گیا ہے۔

قرآنِ حکیم میں جہاد بالسیف (قتال) کے ضمن میں سب سے زیادہ کڑا اور براہِ راست حکم فَاقْتُلُوْهُمْ (انھیں قتل کر دو) دو جگہ آیا ہے۔ ایک بار سورۂ بقرہ میں جس کا تعلق مشرکین کے ساتھ قتال سے ہے اور دوسری بار سورۂ النساء میں جہاں منافقین کو گردن زدنی قرار دیا گیا ہے۔ ان دونوں مقامات پر قتال کے جو اسباب بیان کیے گئے ہیں ان کے وقوع کے امکانات تا قیامت موجود ہیں اور جب جہاں ایسے حالات ہوں، اُمتِ مسلمہ کے لیے قتال کا یہ حکم بلکہ مشرکین و کافرین اور منافقین کے قتل کا یہ حکم اسی طرح واجب ہوگا جیسا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں تھا۔ سورۂ البقرہ ارشادِ ربانی ہے:

> ''اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنیوالوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے لڑو جہاں بھی تمھارا ان سے مقابلہ پیش آئے اور انھیں نکالو اس جگہ سے جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے اس لیے کہ اگرچہ قتل برا ہے مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے اور مسجدِ حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں تم بھی نہ لڑو مگر جب وہاں لڑنے سے نہ چوکیں تو تم بھی بے تکلف انھیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔'' (193-191:2)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

1 ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

2 اگر تمھارا مسکن تم سے چھین لیا جائے تو اس کی بازیابی کے لیے لڑو۔

3 اگر وہ تم سے لڑیں تو کسی قسم کی حرمت کو خاطر میں لائے بغیر تم بھی ان سے لڑو۔

4 اس وقت تک لڑو جب تک فتنہ ختم نہ ہو جائے۔

5 اس وقت تک لڑو جب تک اللہ کا قانون نافذ نہ ہو جائے۔

کیا یہ سبھی حالات و واقعات اور اسباب، کیا ایسی Persecution اور ظلم و جبر نبی ﷺ کے دور کے بعد معدوم ہو گیا ہے!

6 مشرکین سے لڑو۔ 7 کافروں کو قتل کرو کہ ان کی یہی سزا ہے۔

کیا اب ہمارا واسطہ ایسے مشرکین اور کفار سے نہیں جو ہمیں اپنے دین پر نہیں چلنے دیتے حتیٰ کہ اب وہ کھلے چہرے والے حجاب کو بھی زبردستی اتروا رہے ہیں! جہاں کہیں مسلمان خوش حال دکھائی دیں، ان سے تمام قدرتی وسائل چھیننے کے لیے ان پر پل پڑتے ہیں! جس علاقے سے انھیں نظام اسلام کی مہک آتی ہوا سے کھنڈر بنا دینے سے گریز نہیں کرتے!! کیا یہ تمام اسباب و علل ایسے نہیں کہ مسلمان قتال کے لیے تیار ہو جائیں!!

سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

> ”پھر یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں تمھارے درمیان دو رائیں پائی جاتی ہیں حالانکہ جو برائیاں انھوں نے کمائی ہیں ان کی بدولت اللہ انھیں اُلٹا پھیر چکا ہے (88:4) ......لہٰذا ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے نہ آ جائیں اور اگر وہ ہجرت سے باز رہیں تو جہاں انھیں پاؤ انھیں پکڑو اور قتل کرو۔ اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔“ (89:4)

کیا یہ تمام آثار ان منافق مسلمانوں پر صادق نہیں آتے جو ہمارے نواحی ممالک میں کفار و مشرکین کے آلہ کار بن کر (مسلمانوں اور بالخصوص پاکستان کے خلاف) سازشیں اور معاندانہ کارروائیاں کرتے رہتے ہیں!

Marfat.com

''ایک اور قسم کے منافق تمھیں ایسے ملیں گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی مگر جب کبھی فتنہ کا موقع پائیں گے، اس میں کود پڑیں گے۔ ایسے لوگ اگر تمھارے مقابلہ سے باز نہ رہیں اور صلح وسلامتی تمھارے آگے پیش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو جہاں وہ ملیں انھیں پکڑو اور مارو۔ ان پر ہاتھ اُٹھانے کے لیے ہم نے تمھیں کھلی چھٹی دے دی ہے۔'' (91:4)

ایسے منافقین جو مسلمانوں کو اپنا دوست کہتے ہیں لیکن کفارومشرکین کے ساتھ بھی دوستی اور محبت کے رشتے استوار کرتے ہیں، ہمارے نواحی ممالک میں بھی ہیں اور خود ہمارے اپنے ملک میں بھی۔ ایسے منافقین جو اپنے کافرومشرک دوستوں کی خوشنودی کے لیے مطالعہِ قرآن سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف ہوں، جو اپنے مشرک اتحادیوں کے ساتھ مل کر اپنے ہم مذہبوں پر بمباری کرتے ہوں اور جو تمام شعائرِ اسلام اور ہر طرح کے شعارِ مسلمین کو قابل نفرت جانتے ہوں، جو حدود اللہ کو پامال کرنے کے تمام راستے ہموار کرنے کی سعی میں مصروف ہوں، جو مسلمانوں کے اندر فحش کو پھیلانے کے لیے تمام حربے استعمال کر رہے ہوں ......کیا ایسے منافقین واقعتہً گردن زدنی قرار نہیں دیے جاسکتے! جس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کھلی چھٹی دے دی ہو، اسے مسدود کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔

✿✿✿✿

شہادتِ حق کی ذمہ داری جس طرح انبیا پر تھی اسی طرح افرادِ اُمت پر بھی ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (143:2)

''اور اس طرح تو ہم نے تمھیں عدل وانصاف کی روش پر قائم ایک اعلیٰ اُمت بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر دعوتِ حق بیان کرو اور رسول تم پر اعلانِ حق کی ذمہ داری پوری کرے۔''

شہادتِ حق کی یہ ذمہ داری، ہر وقت اور ہر علاقے میں بلا لحاظ جاری وساری رکھنا، اعلائے کلمۃ الحق کی جدوجہد، فتنے کا استیصال، ظلم وجبر کا خاتمہ، ہر طرح کے اکراہ سے نجات کی

Marfat.com

جدّ وجہد، کفار و مشرکین کا تعاقب اور منافقین کی گردن کُشی، پوری اُمتِ مسلمہ کا اجتماعی فریضہ ہے۔ اگر اُمت آج بھی اتمام حجت کے تمام تقاضے پورے کر دے تو باوجود کمزور اور کم مایہ ہونے کے سنت اللہ کی تائید اس کے لیے بھی جاری ہوسکتی ہے۔ بقول علامہ محمد اقبال:

فضائے بدر پیدا کر، فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

بعض وابستگانِ مکتبِ فراہی اپنے دلائل کی کمزوری سے آگاہی کے باعث یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآنِ حکیم نبیِ اکرم ﷺ کی تاریخ بھی ہے چنانچہ جہاد و قتال اور بعض دیگر احکامات کو نبی ﷺ کی ذات سے مخصوص جان کر نبی ﷺ کی تاریخ کے طور پر ہی دیکھنا چاہیے نہ یہ کہ ایسے خصوصی احکامات کو اُمتِ مسلمہ کے لیے عمومی حکم سمجھ لیا جائے۔

یہ مغالطہ آرائی قرآنِ حکیم کے فلسفۂ تاریخ سے روگردانی کے مترادف ہے۔ قرآن میں انبیا کرام، سابقہ اُمتوں اور چیدہ چیدہ منکرینِ حق کے احوال ''انذار'' کے لیے بیان ہوئے ہیں کہ ان سے نصیحت، موعظت اور تذکیر کا کام لیا جائے۔ بعینہٖ نبیِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے ساتھ ساتھ مشرکین اور منافقین کے احوال قرآنِ پاک میں اس قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے کا مقصد محض تاریخ نویسی کا شوق پورا کرنا نہیں بلکہ اس کا مقصد بھی انذار اور تذکیر ہے۔ قیامت تک آنے والے تمام ادوار میں اُمتِ مسلمہ کو انھی مثالوں سے رہنمائی حاصل کرنا ہے۔ از روئے قرآن جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا اسوۂ حسنہ لائقِ تقلید ہے، اسی طرح بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر اسوۂ رسول ﷺ اور اسوۂ صحابہ پر عمل ہمارے لیے لازم ہے۔ یہ انداز قطعاً ناروا ہوگا کہ نبی ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے احوال انھی کے ساتھ، یہ خون آشامی انھی کو مبارک ہو، ہم تو دورِ حاضر کی انسان دوستی اور انسان پرستی کے تقاضے ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے آسانی کی راہ، صلح و صفائی اور امن و آشتی ہی کے راستے اختیار کریں گے۔

قرآن پاک کا فیصلہ بالکل واضح ہے لیکن وابستگانِ مکتبِ فراہی نے آیاتِ قرآنی سے اپنے موقف کے حق میں استدلال کے لیے ترجمے کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا ہے اور سیاق و سباق سے بھی بے نیازی برتی ہے۔ سورۂ المائدہ کی آیات 32 تا 34 میں اللہ تعالیٰ نے قتلِ

Marfat.com

انسانی کو ایک ناپسندیدہ فعل قرار دیا ہے اس کے باوجود اگلی ہی آیت میں مسلمانوں کو قتال کا حکم دیا اور اس کی وجہ کی نشاندہی بھی کر دی۔ ارشاد ہوا کہ بنی اسرائیل (یعنی اہلِ کتاب) کے پاس ہم نے اپنی واضح ہدایات بھیجیں لیکن اہل کتاب (یعنی بنی اسرائیل) زمین میں زیادتیاں کرنے سے باز نہیں آئے (اس جگہ مکتب فراہی کی جانب سے دانستہ ارض کا معنی زمین کی بجائے ملک کر لینے سے معاملہ نہایت محدود ہو کر رہ جاتا ہے) فرمایا کہ زیادتیاں کرنے کا یہ عمل اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ (یعنی دین اسلام اور اُمتِ مسلمہ کے ساتھ) کھلی جنگ ہے۔ (حرب کا معنی جنگ ہے لیکن جان بوجھ کر اس کا ترجمہ بغاوت کیا جائے جیسا کہ مولانا اصلاحی نے کیا، تو حکم کی تعبیر بدل جاتی ہے) پھر فرمایا کہ ان کھلی جنگ کرنے والوں، فساد برپا کرنے والوں کی سزا یہ ہے کہ مسلمان انھیں قتل کریں اور اذیّت ناک سزائیں دیں۔ تاہم مسلمانوں کی جانب سے پُر اثر دھمکی پر اگر اہلِ کتاب فساد سے باز آ جائیں تو انھیں اصلاح کا موقع دیا جائے۔ اس طرح یہ بات واضح کر دی کہ مسلمانو! تمھیں انسانیت سے محبت کے غم میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرنے والوں یعنی دینِ اسلام اور اُمتِ مسلمہ سے کھلی دشمنی اور جارحیت کا ارتکاب کرنے والوں کے ساتھ نرم رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے بلکہ انھیں عبرتناک سزائیں اور اذیّتیں دینے پر مسلمانوں کو آمادہ کیا جا رہا ہے۔

زیادتیاں کرنے کے معاملے کو پوری تفصیل سے سمجھنا ضروری ہے یہ بھی زیادتی ہے کہ کسی کو بلا وجہ قتل کیا جائے۔ یہ بھی ظلم ہے کہ قاتلوں اور فتنہ گروں کو تحفظ دیا جائے، فساد برپا کرنے والوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ یقیناً قاتلوں کو چھوڑ دینا پوری انسانیت کا قتل ہو گا اور ایسے مسرفین کو کیفرِ کردار تک پہنچانا پوری انسانیت کو زندہ کرنے کا ہم معنی ہو گا۔ اسی مفہوم کو قرآن نے ''استیصالِ فتنہ'' سے تعبیر کیا ہے: وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ۔ قتال کا یہ مقصد پورا ہونے تک قتال جاری رہے گا۔

سورۃ المائدہ کی جن آیات کا مفہوم اوپر بیان ہوا اُن کا ترجمہ اس طرح ہے:

''اس وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر فرض کیا کہ جس کسی نے کسی کو قتل کیا، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، یا زمین میں فساد برپا کیا ہو تو گویا

Marfat.com

اس نے سب کو قتل کیا اور جس نے اس کو بچایا تو گویا اس نے سب کو بچایا۔ اور ہمارے رسول ان کے پاس واضح احکام لے کر آئے لیکن اس کے باوجود ان میں سے بہت سے ہیں جو زمین میں زیادتیاں کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرنے میں سرگرم ہیں بس یہ ہے کہ عبرتناک طور پر قتل کیے جائیں یا سولی چڑھائے جائیں یا اُن کے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹ ڈالے جائیں یا ملک سے باہر نکال دیے جائیں۔ یہ اُن کے لیے اس دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے ایک عذابِ عظیم ہے۔ مگر جو لوگ تمھارے ان پر غلبہ پانے سے پہلے توبہ کرلیں تو سمجھ لو کہ اللہ مغفرت فرمانے والا اور مہربان ہے۔'' (المائدہ: آیات 32 تا 34)

ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب لکھا ہے:

'' آیت کی جو شانِ نزول احادیثِ صحیحہ میں بیان ہوئی ہے وہ بھی اس کی مقتضی ہے کہ الفاظ کو ان کے عموم پر رکھا جائے۔'' اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنا یا '' زمین میں فساد اور بدامنی پھیلانا'' دو لفظ ایسے ہیں جن میں کفار کے حملے، ارتداد کا فتنہ، ڈکیتی، رہزنی، ناحق قتل، مجرمانہ سازشیں اور مغویانہ پروپیگنڈہ ......سب داخل ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر جرم ایسا ہے کہ جس کا ارتکاب کرنے والا ان چار سزاؤں میں سے جو مذکور ہیں کسی نہ کسی کا ضرور مستحق ٹھہرتا ہے۔'' (مطلب یہ کہ ان آیات میں اہلِ کتاب کا مجموعی رویہ زیر بحث ہے) اس تفسیر میں '' کفار کے حملے'' اور '' عموم پر رکھا جائے'' کے الفاظ قابل غور ہیں۔ اس کے بعد علامہ محترم یُنفَوا مِنَ الاَرضِ کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں: '' کہیں اور لے جا کر انھیں قید کر دیں۔'' (یعنی محض دور لے جانا کافی نہیں)

مشرکین اور منافقین سے قتال کے بارے میں سورۃ البقرہ اور سورۃ النساء کی چند آیات پہلے درج کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ سورۃ مائدہ کی یہ آیات ہیں جن کا رخ واضح طور پر بنی

Marfat.com

اسرائیل (اہلِ کتاب) کی معاندانہ کارروائیوں کی جانب ہے۔ اہلِ کتاب سے دوست داری اور انھیں اپنے علاقے، اپنی زمین میں تصرف کا اختیار دینے کی بجائے (جبکہ وہ مسلمانوں کو علی الاعلان قتل بھی کر رہے ہیں، ایذائیں بھی پہنچا رہے ہیں، اُمتِ مسلمہ کے خلاف فتنہ گری بھی کر رہے ہیں اور مسلمان ملکوں کے خلاف سازشیں بھی کر رہے ہیں)۔ ایسی صورت میں قرآن کا فیصلہ ہے کہ ان اہلِ کتاب سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ، دین اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کھلی جنگ کرنے والوں سے قتال کرو، انھیں عبرتناک سزائیں دو، انھیں اپنے علاقوں سے نکال باہر کرو، انھیں قید میں ڈالو اور ممکن ہو تو انھیں قتل کرو۔

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ:

تمام انبیا ؊ کی دعوتی جدوجہد کے بارے میں اللہ تعالیٰ مختلف فیصلے فرماتا رہا ہے۔ کبھی نو سو برس تک تکذیب کرنے والی قوم کو مہلت دے دی، کبھی انبیا کی وفات کے بعد بھی جھٹلانے والی قوم کو مہلت دیے رکھی۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب وہ کسی قوم کو عذاب دینے کا فیصلہ کر لے تو انبیا کی استدعا، عذاب کو دیکھ کر قوم کا مہلت مانگنا یا ایک قوم پر آنے والی آفت کے لیے کسی دوسرے جلیل القدر نبی کی دعائیں بھی اس عذاب کو ٹال نہیں سکتیں۔ اس اُمتِ وسط کو شہداء علی الناس (لوگوں کے سامنے دین حق پیش کرنے کے لیے مکلف) ہونے کی وجہ سے تاقیامت دعوتِ دین، استیصالِ فتنہ اور اتمام حجت کا فریضہ انجام دینا ہے۔ چنانچہ یہ ناممکن ہے کہ قتال کے مراحل نہ آئیں۔ یہی جہاد اور صبر (یعنی استقامت) کا امتحان ہے۔

❁❁❁❁

Marfat.com

روح کا قرآنی تصور

روح کیا ہے۔۔اس بارے میں قرآنِ حکیم نے جو کچھ بتایا ہے، صاحبانِ عقل کے لیے بہت کافی ہے مگر فلاسفہ اور صوفیا ہیں کہ قرآنِ حکیم نے عربیٔ مبین میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس پر غور نہیں کرتے اور روح کے نت نئے معانی پر اصرار کرتے ہیں۔ مفسرین نے بھی اپنی کتب میں ایسی تمام باہم دگر متضاد آرا اکٹھی کردی ہیں جس کے سبب روح اور نفس کے اصل معانی غائب ہوگئے ہیں۔ روح کا قرآنی تصور پیش کرنے سے پہلے، فلاسفہ کی آرا ملاحظہ فرمائیں:

فلاسفہ اور صوفیہ، انسان کو جیسا کہ وہ چشمِ ظاہر سے دکھائی دیتا ہے، اپنی صفات اور صلاحیتوں سمیت، درجِ ذیل ظاہری اور باطنی اُمور کا مرکب جانتے ہیں۔

1 انسان کا جسد بالکل ایسے ہی جیسے حیوانات کے جسم ہیں۔

2 انسان کے اندر جان جس طرح تمام حیوانات میں ہے۔

3 روح جو انسان کا غیر مرئی وجود ہے، جسد سے الگ بھی اسی جیسی ہیئت رکھتی ہے۔ روح جب بدن سے الگ ہو تو بھی اس میں جان، نفس اور نسمہ سبھی کچھ موجود ہوتا ہے۔ یہ غیر مرئی وجود مثلِ ملائکہ ہے۔ روح انسانِ اوّل کی پیدائش سے پہلے بھی موجود تھی اور انسان کے مرنے کے بعد بھی زندہ وسلامت، زندہ انسان سے زیادہ صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہے۔ روح انسان کے مرنے کے بعد سیرِ دنیا اور سیرِ فلک کرتی ہے۔ اولیا اللہ کی ارواح (جیسا کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سمجھتے ہیں) انسان کے مرنے کے بعد ملائکہ میں تبدیل ہوجاتی ہیں اور اُمورِ غیب والشّہادۃ میں متصرف ہونے کی اہل ہوتی ہیں۔ (دیکھیے شاہ صاحب کا حظیرۃُ القُدس کا نظریہ)

تخلیقِ آدم سے پہلے ارواحِ انسانی ایک عالمِ مثال میں رہتی تھیں اور انسان کے مرنے

Marfat.com

کے بعد یہ ارواح، عالمِ برزخ میں قیام کرتی ہیں لیکن دنیا سے ان کا تعلق ختم نہیں ہوتا۔

4 جسد، جان اور روح کے علاوہ انسان میں ایک چوتھا عنصر بھی ہے جسے نفس کہتے ہیں۔ انسانی بدن میں وہ غیر مرئی صلاحیت جو اپنی الگ شناخت رکھتی ہے اور الگ وجود کی حامل ہے۔ نفس کی تین کیفیتیں، حالتیں اور صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک ایسا وجود جو شیطان کے بہکاوے میں آ کر شر پر آمادہ ہو نفسِ امّارہ ہے۔ ایسا نفس جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملنے والے سکون و ثبات کے سبب گناہوں سے مجتنب اور رضائے الٰہی کا طالب ہے، نفسِ مطمئنّہ کہلاتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان نفسِ لوّامہ ہے جو گناہوں پر آمادگی سے روکنے والا ہے، تنبیہہ کرنے والا ہے۔

اس کے علاوہ بھی نفس کی کئی تعبیریں صوفیا کے ہاں ملتی ہیں جیسے کہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی صوفیا کے افکار کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''روح وہ جوہر ہے جس کی بدولت جسم میں زندگی ہے۔ نفس وہ گرم ہوا ہے جس کی بدولت انسان میں حرکت، سکون اور شہوت پیدا ہوتی ہے''۔

رسالہ قشیریہ میں (جو صوفیا کی بائبل کا درجہ رکھتی ہے) لکھا ہے:

الرّوح: لطیفۃ موَدّۃ فی ھذہ القوالب۔ ھی محل الاخلاق المحمودہ۔

النفس = ما کان معلوماً من اوصافِ العبد و مذموماً من اخلاقہ و اوصافہ

5 نسمہ: روح سے بھی لطیف ایک عنصر جو اپنے وجود کے لیے کسی دوسرے حیوانی وجود کا سہارا لیتا ہے۔ جس طرح بعض روایات میں ہے کہ شہدا (مقتولین فی سبیل اللہ) کا نسمہ جنت کی چڑیوں کے پوٹوں میں رہتا ہے۔

6 عقل: انسان میں وہ ملکہ جو اسے تفکر و تدبر کی صلاحیت بخشتا ہے، صوفیہ کی رائے میں ایک الگ وجود رکھتا ہے۔ ابنِ سینا کہتا ہے کہ انسان کی تخلیق طریقِ تعقل کے توسّط سے عمل میں آئی ہے۔ واحد (ذاتِ خداوندی) سے وحدت وجود میں آئی، جو عقلِ اوّل ہے (اسی کو صوفیا حقیقتِ محمدیہ کہتے ہیں) پھر عقلِ دوم (فلکِ اوّل کی) روح اور (فلکِ اوّل کا) جسم وجود میں آیا۔ گویا عقل، روح اور جسم تینوں کا الگ الگ وجود ہے۔ عباس محمود العقاد لکھتے ہیں:

''نفس، عقل اور روح، تینوں قوتیں مل کر انسانی ذات بنتی ہیں''۔

Marfat.com

فلاسفہ اور صوفیہ کی ان گونا گوں آرا سے انسان کا ایک عجیب و غریب تصور بنتا ہے۔ ایسی ہی بہت سی باہم دگر متضاد باتیں، امام ابن القیم کی کتاب الرّوح میں بھی ملتی ہیں۔ تاہم کہیں کہیں اس کتاب میں کچھ باتیں حقیقتِ واقعہ سے قریب ترین ہیں۔ مثلاً

''نفس کے کئی معانی ہیں، روحِ جوہری، خون، نظر، جسم، ذات وغیرہ''۔

(ص328)

''میں کہتا ہوں جو روح قبض کی جاتی ہے، وہ ایک ہی ہے اور اسی کو نفس کہتے ہیں اور جس روح سے اللہ اپنے دوستوں کی مدد فرماتا ہے، وہ اور روح ہے، انسانی روح نہیں۔ اسی طرح وہ روح (وحی) دوسری ہے جسے اللہ اپنے بندوں میں جس پر چاہتا ہے، ڈال دیتا ہے'' (332)۔

ملاحظہ کریں، کس طرح صحیح اور غلط اُمور کو باہم دگر خبط کر دیا گیا ہے اور یہ جسارت بھی ملاحظہ کریں کہ روح اور نفس کو ایک دوسرے کے مترادف گنا جا رہا ہے۔ یہی بنیادی غلطی مقاتل بن سلیمان کی کتاب الوجوہ والنظائر میں بھی ہے اور راغب اصفہانی کی مفردات القرآن میں بھی۔

عربی ایک نہایت وسیع زبان ہے۔ ہر شے یا حکم کے لیے عربی زبان میں علیحدہ لفظ بآسانی مل جاتا ہے۔ جہاں کسی شے کی کیفیت، کمیت یا مزاج واحوال میں کوئی فرق واقع ہو، عربی زبان کی وسعت ان تمام بدلتے ہوئے اُمور کا بخوبی احاطہ کر لیتی ہے اور حسبِ حال اس حالت کے درست بیان کے لیے الگ لفظ مل جاتا ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ نے بھی المنجد (اُردو) کے دیباچے میں بیان کیا ہے کہ تلوار، شیر، شراب حتیٰ کہ مصائب وآلام کے لیے عربی زبان میں سینکڑوں الفاظ ہیں۔

اس وضاحت سے یہ باور کرانا مقصود ہے کہ یہ درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے کہ عربی کے ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہو سکتے ہیں یا جیسا کہ اکثر اہلِ علم کا خیال ہے ایک لفظ، دوسرے لفظ کا مکمل مترادف ہو سکتا ہے مثلاً نفس کا معنی روح اور روح کا معنی نفس۔

ہاں البتہ یہ درست ہے کہ ہر مادّے کے مختلف النوع مشتقات سے لفظ کی شکل اور معنی بدل جاتے ہیں اور فعل کے مختلف ابواب کے بھی اپنے اپنے خواص ہیں۔ مثال کے طور پر قطع کی بجائے قَطَّعَ مزید زور دینے کے لیے، قبل (سامنے ہوا) کی بجائے تقابل (ایک دوسرے کے

Marfat.com

آمنے سامنے ہونا) وغیرہ۔ ایک ہی مادّے اور بنیادی معنی کے کسی حد تک بدل جانے کی ایک صورت حروفِ جار کا استعمال بھی ہے۔ مثلاً رَغِبَ کے بنیادی معنی ہیں: کسی کام یا شے کے مقابل ردِّعمل کا اظہار۔ اب اگر رغب الیہ ہو تو اس کا معنی ہوگا: ''اس کی طرف جھکا'' اور اگر اس کی بجائے رغب عنہٗ کہا جائے تو اس کا معنی ہوگا: ''اس سے اعراض کیا''۔ اس طرح حرفِ جار کے استعمال سے بھی لفظ کی اصلی داخلی کیفیت نہیں بدلتی، دلالت میں اختلاف ہو سکتا ہے۔

روح ایسی شے ہے جس سے انسانی جسد زندگی پاتا ہے۔ روح کے بنیادی معنی ایک ہی ہیں یعنی ''امر اللہ''۔ اللہ کا حکم۔ اب اس کے اوصاف اور کردار میں جو تبدیلی واقع ہوتی ہے اور جو جو فرق پڑتا ہے، اس کے مطابق اللہ تعالیٰ اسی مطلوبہ مفہوم کے اظہار کے لیے دیگر قریب قریب ہم معنی الفاظ استعمال کرتا ہے۔

اللہ کے حکم، امر اللہ کی مختلف نوعتیں حسب ذیل ہو سکتی ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے روح کے معنی سے ملتے جلتے الفاظ قرآنِ حکیم کی آیات کی زینت بنائے ہیں:

1 جب اللہ کے قول کی بات ہو تو فرمایا:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (82:36)

اس حالت میں امر، قول ہو جاتا ہے۔

2 جب اللہ کے نطق کی بات ہو (قول مخصوص ہے اور نطق عموم پر دلالت کرتا ہے) تو فرمایا:

كَلِمَتُهٗٓ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ (171:4)

یعنی امرِ تخلیق مختلف کلمات سے عبارت ہے، انھی میں سے ایک کلمہ مریم! تک بھیجا۔ یہ کلمہ ''کن'' بھی ہو سکتا ہے۔

فلاسفہ اور مشرکین پہلے کلمہ کو اللہ کی صفت قرار دیتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ اللہ کی صفت ''کلمہ'' (یعنی بجائے خود اللہ) بدن میں حلول کر گیا۔ حالانکہ کلمہ یا کلام، صفت نہیں ہیں۔ اللہ کی صفت ہے اس کا متکلم ہونا، اس کا کلام کرنا، اسی مغالطے کی وجہ سے قرآنِ حکیم کو جو اللہ کا کلمہ اور اس کا کلام ہے، اللہ کی صفت جان کر اس کے قدیم ہونے پر اصرار کیا جانے لگا حالانکہ قرآن بھی اللہ کا کلمہ، اللہ کا کلام ہونے کے سبب دیگر مخلوقات کی طرح، اللہ کی مخلوق ہے۔ بعینہٖ جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا کلمہ کہا گیا اور وہ بھی اللہ کی مخلوق، اللہ

Marfat.com

کے ایک بندے ہیں۔

3 جب کسی شے کی تخلیق کے بعد اسے فعّال اور متحرک بنانا مقصود ہو تو اس کے لیے وحیِ امر کے الفاظ آتے ہیں۔

فَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا (12:41)

4 جب اس شے کی حقیقت بتانا مقصود ہو جو نشو و نمو اور حرکت و زندگی کا منبع ہے تو اسے مجرد ''روح'' کہا جاتا ہے۔

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي (29:15)

5 جب ملائکہ کو حکم دے کر بھیجا جاتا ہے، تو حاملینِ امرِ ربّ کو، حاملینِ وحی، حاملینِ روح ہونے کی نسبت سے انھیں بھی ''روح'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ (22:58)

عربی زبان کے قاعدے کی رو سے حاملِ شے کو شے کہا جا سکتا ہے۔ تسمیةُ الشّيِ بما یئول الیه جیسے یوسف علیہ السلام کے جیل کے ایک ساتھی نے اپنا خواب سناتے ہوئے کہا: انّی ارانی اعصر خمراً۔ حالانکہ عیاں ہے کہ اعصر کے ساتھ انگور کا لفظ آنا چاہیے تھا لیکن انگور میں خمر موجود ہے اس لیے، اسی کو کہہ دیا کہ اعصر خمراً (36:12)

6 امرِ ہدایت، ''روح'' لے کر آنے والے ملک (فرشتے) کو بالخصوص معرفہ قرار دے کر ''الرّوح'' کہا گیا ہے یعنی جبریلِ امین: قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (85:17)

7 خود امرِ ہدایت کو جو تمام اُمور میں سے اہم ترین ہے، اس کی خصوصی اہمیت کے باعث الرّوح کے نام سے پکارا گیا: يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (15:40)

ان دونوں آیات (6، 7) میں الرّوح سے خواہ وحی مراد لے لیں یا حاملِ وحی، دونوں طرح کوئی مضائقہ نہیں۔

اس طرح ثابت ہوا کہ ''روح'' انسانی بدن میں ''جان'' کے ایک وسیع تر مفہوم کا حامل لفظ ہے۔ انسان جیسا کچھ وہ چشمِ ظاہر سے دکھائی دیتا ہے اپنی تمام داخلی کیفیات سمیت صرف دو اجزا پر مشتمل ہے:

Marfat.com

الف۔ انسان کا جسد جس میں تمام حیوانی صلاحیتیں بھی موجود ہیں اور اس کے ذہن و قلب میں تمام داخلی جذبات، کیفیات، احساسات، سمجھ بوجھ، عقل و فکر کا ملکہ بھی۔

ب۔ انسان کے اندر اسے زندہ اور متحرک رکھنے والی اور اس کی اپنی ذات کے حوالے سے مخصوص صلاحیتیں بخشنے والی روح جو اس کی جان بھی ہے اور اس کی مخصوص شخصیت کے احوال و کوائف کی حامل بھی۔

جسد اور روح مل کر پورا انسان بنتا ہے، اپنی کامل شخصی خصوصیات کے ساتھ اور اسی کو قرآنِ حکیم نے ''نفس'' کا نام دیا ہے۔ یہی نفس یعنی انسان کا پورا وجود اور شخصیت، امارہ بھی ہے، لوّامہ بھی اور مطمئنہ بھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے اللہ تعالیٰ اپنی ذات کو نفس کہہ کر پکارتا ہے۔ کتب علٰی نفسهِ الرّحمة (12:6) قرآنِ حکیم نے متعدّد مقامات پر یہ اصطلاح (نفس) استعمال کی ہے۔ اس کے تمام استعمالات کا بالتفصیل جائزہ لیں تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے (ملاحظہ ہو: قرآنِ حکیم اور انسان۔ ایوّبی)

❁❁❁❁

''روح'' کے بارے میں ان تمام فلسفیانہ، صوفیانہ افکار کی وضاحت کے بعد اور عربی زبان کے بعض قواعد کی تفہیم کے بعد اب ہم دیکھیں گے کہ قرآنِ حکیم کی متعدّد آیات میں لفظ ''روح'' کن معنوں میں آیا ہے۔

قرآنِ حکیم میں لفظ ''روح یا الرّوح'' متعدّد مقامات پر آیا ہے۔ اگر ہم ہر جگہ کی مناسبت سے روح کے معانی متعین کرنے کی کوشش کریں تو اس کی بنیادی طور پر دو ہی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ یا تو یہ لفظ روح امرِ تکوین کے لیے آیا ہے یا امرِ ہدایت کے لیے۔ دونوں صورتوں میں اس کے اصل معنی ''امر اللہ'' ہی ہیں۔ حاملینِ امرِ الٰہی (ملائکہ) اپنے وجود کے اعتبار سے اور اس لحاظ سے کہ ''یفعلون مایؤمرون'' بذاتہم روح یا الرّوح کہلاتے ہیں۔ ملائکہ کے ہاں نہ بدنی آلائشیں ہیں، نہ خورد و نوش، نہ ہی سلسلۂ توالد، نہ سونا جاگنا، نہ ہی ان کی کوئی ایک مخصوص ہیئت ہے۔ ملائکہ کائنات کے ہر گوشے میں موجود ہیں، اس میں سرایت کرتے ہیں اس لیے کہ کائنات کی ہر شے کی تخلیق، تسویہ اور نشو و نمو، حالت کی ہر تبدیلی اور بناؤ بگاڑ، ملائکہ کی ذات سے سرزد کروایا جا رہا ہے۔ اسی لیے متعدّد مقامات پر قرآنِ حکیم نے ملائکہ (حاملینِ امرِ تکوین یا امرِ ہدایت) کو

Marfat.com

روح یا الرّوح کہا ہے۔اسی بنا پر روح کی اصل تعریف یہی ہے: ''مابہ التحرّک والحیاۃ''۔

متعدّد آیاتِ قرآنی میں بالخصوص عیسائیوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ تم ہمارے ایک بندے، عیسیٰ علیہ السلام کو ذاتِ الٰہی کا ایک حصہ، ذاتِ بحت کا ایک جز سمجھ کر اسے الٰہ کا درجہ دے رہے ہو حالانکہ اللہ کی دیگر مخلوقات کی طرح عیسیٰ بھی ہمارا ایک بندہ، ہماری ہی ایک مخلوق ہے جو دیگر تمام تخلیقات کی طرح ہمارے ''امر'' سے وجود میں آیا ہے۔مریم] کے رحم میں موجود بیضہ سے، بغیر کسی مرد کے نطفے کے، صرف ہمارے امر سے ایک بچہ تخلیق پا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے امرِ تکوین کا ایک معمولی کرشمہ ہے۔

1 سورۃ الانبیاء

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا فَنَفَخْنَا فِیْھَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰھَا وَابْنَھَآ اٰیَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (91:21)

اور اس بی بی مریم کو یاد کرو جس نے اپنی شرم گاہ کو کنوار پن کی حالت میں سنبھالے رکھا پس ہم نے مریم کے بدن میں اپنا امرِ تکوین (اپنی روح) پھونک دی اور اس طرح مریم اور اس کے بیٹے کو لوگوں کے لیے اپنی قدرتِ کاملہ کی نشانیاں بنا دیا۔

2 سورۃ التحریم

وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا فَنَفَخْنَا فِیْہِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِکَلِمٰتِ رَبِّھَا وَ کُتُبِہٖ وَکَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ (12:66)

اس آیت میں بھی سورۃ الانبیاء والے ہی الفاظ ہیں۔ان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ مریم] نے: صَدَّقَتْ بِکَلِمٰتِ رَبِّھَا۔ مریم نے اپنے ربّ کے کلمات کی تصدیق کر دکھائی۔ اب چونکہ ان الفاظ کے ساتھ ہی و کتبہ کی تصدیق کا ذکر بھی ہے اس لیے واضح ہوا کہ کتب کے ذریعے اللہ کے امرِ ہدایت اور کلمات کے ذریعے اللہ کے امرِ تکوین کی جانب اشارہ ہے۔یعنی ایک انسان کی رحمِ مادر میں ایک انوکھے اور اچھوتے انداز میں تخلیق۔

3 سورۃ النّساء

اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَہٗٓ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ وَلَدٌ (171:4)

اس آیت کریمہ میں ارشاد ہوا کہ اللہ تو بس ایک ہی الٰہِ واحد ہے۔نہ وہ کسی کا باپ ہے،

Marfat.com

نہ کوئی اس کا بیٹا۔ افراط وتفریط سے باز آجاؤ، اللہ کو اس کے اپنے مقام پر رکھو اور اس کی مخلوق کو اس کی اپنی حیثیت میں پہچانو۔ ثالث ثلاثہ کہہ کر کسی مخلوق کو اللہ کی ذات کا حصہ نہ بناؤ۔ اوروں کا تو کیا مذکور، عیسیٰ علیہ السلام بھی اپنے تمام خارق عادات احوال کے باوصف اللہ کا ایک بندہ ہے:

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ (171:4)

''بیشک مسیح عیسیٰ، ابن مریم ہے (نہ ابن اللہ ہے، نہ کسی مرد کا بیٹا ہے) اللہ کا پیغامبر ہے۔ اللہ کا وہ فرمان ہے جو اس نے مریم پر القا کیا اور اللہ ہی کی جانب سے ایک امرِ تکوین (روح) ہے۔

4 سورۂ البقرہ

وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ (87:2)

اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے کھلے دلائل (معجزات) دیے اور روح القدس کے ذریعے اس کی مدد کی۔

5 سورۂ البقرہ، آیت 253

اس آیت میں بھی سورۂ البقرہ کی آیت 87 کے الفاظ آئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کے ساتھ خصوصی سلوک (ان کی معجزانہ پیدائش اور دیگر معجزات) وہ معجزات جو کسی اور مخلوق حتیٰ کہ انبیا کو بھی نہ دیے گئے، ان کے بارے میں ارشاد ہوا کہ ہم نے اپنے رسولوں میں سے بعض کو دوسروں پر فوقیت دی ہے اور بعض کے درجات دوسروں کے مقابلے میں بلند تر کر دیے ہیں۔ اس لیے کسی نبی کے لیے معجزات کا ہونا نہ ہونا ہمارے اختیار میں ہے اور کسی اور نبی کی فضیلت کسی دوسرے سبب سے ہو سکتی ہے۔

6 سورۂ المائدہ، آیت 110

اس آیۂ مبارکہ میں ارشاد ہوا کہ اے عیسیٰ یاد کرو کس طرح میں نے روح القدس کے ذریعے تیری مدد کی (إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ 110:5) والدۂ مسیح کے ذکر سے بات شروع ہوئی، مقصد یہ کہ عیسیٰ کی پیدائش، ان کا جھولے میں کلام، انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم، ان کے ہاتھ سے پرندوں میں جان ڈالنا، عیسیٰ کے ہاتھوں اندھے اور کوڑھی کا علاج، احیائے موتیٰ اور

Marfat.com

صلیب دینے پر تلے ہوئے بنی اسرائیل کے ہاتھوں سے عیسیٰ کو بحفاظت نکال لینا۔ یہ تمام خارقِ عادت اُمور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرشتے کے ذریعے انجام دیے جو حاملِ امرِ تکوین بھی ہے اور حاملِ امرِ ہدایت بھی، روح القدس یعنی جبریلِ امین۔

7 سورۂ مریم

سورۃ المائدہ میں روح القدس کے ہاتھوں انجام پانے والے تمام معاملات کا تذکرہ ہے اور اس آیت میں بالخصوص اس واقعے کا ذکر ہے جب مریم علیہا السلام کو ایک بیٹے کی ولادت کی خوش خبری سنائی گئی اور اس کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (17:19)

پس ہم نے مریم کی طرف اپنے ایک سراپا حکم (روح) کو بھیجا جو اس کے سامنے ایک مکمل مرد کی صورت میں آ کھڑا ہوا۔

حضرت مریم جیسی پاکباز خاتون ایک مرد کو دیکھ کر گھبرا گئیں۔ جب اس فرشتے نے اپنا تعارف کروانے کے بعد اولاد کی خوش خبری دی تو مریم نے کہا کہ مجھے تو مرد نے چھوا تک نہیں۔ فرشتے نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ ایسا ہونا۔۔۔ ''اللہ کی جانب سے لوگوں کے سامنے ایک نشانی ہوگا'' (سورۂ مریم آیت 21) پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ملائکہ (فرشتے) عبادنا المکرمون ہیں۔ اللہ کے احکام بلا چون و چرا ماننے والے، سراپا عبادت، سراپا حکم، سراپا روح ہیں۔ مریم ایک انسان تھیں، انھیں اتنے بڑے واقعے کی پیشگی اطلاع محض القاء یا الہام کی صورت میں نہیں، ایک پیغام رساں (رسول، فرشتے) کے ذریعے دی گئی اور اللہ کے حکم سے رحمِ مریم میں بھی انھی غیبی قوتوں نے حکمِ ربّ کا نفاذ (امر اللہ۔ روح اللہ کا نفاذ) شروع کر دیا جو پوری کائنات میں اللہ کے حکم سے تدبیرِ امر کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔

8 سورۃ المجادلہ

جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کی روح کے ذریعے مدد کی گئی، اس آیت میں ارشاد ہوا کہ ہم اپنے نیک بندوں کی بھی روح کے ذریعے مدد کرتے ہیں:

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (22:58)

اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان نقش کر دیا ہے یعنی (اپنے حکم، اپنے

Marfat.com

امرِ ہدایت) اپنی روح سے ان کی مدد کی ہے۔

یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جدوجہدِ حیات میں اللہ اپنے امرِ تکوین کے ذریعے ان کی مدد کرتا ہے۔

9 سورۃ المعارج

اس سورہ کے آغاز میں ہی قیامت کے دن کا ذکر ہے جب کارکنانِ قضا و قدر یعنی ملائکہ بالعموم اور امرِ ہدایت لے کر آنے والے، الرّوح یعنی جبریل امین، کائنات کے طول و عرض میں عذابِ قیامت برپا کر رہے ہوں گے اور اپنی اپنی رپورٹ لے کر عالی شان مراتب والے ربّ کے حضور حاضر ہو رہے ہوں گے۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ (4:70)

ملائکہ اور جبریل امین، اللہ کی جناب منزلیں طے کر رہے ہوں گے۔

10 سورۃ النبا

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا (38:78)

جب ملائکہ اور جبریلِ امین صفیں باندھے کھڑے ہوں گے۔

یہ یومِ حساب کا ذکر ہے جب دفترِ عمل انسانوں کے سامنے لائے جائیں گے۔ اسی جگہ ارشاد ہوا کہ اللہ کے سامنے کوئی بولنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اور دوسری جگہ کی وضاحت کو ساتھ ملا کر پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف ملائکہ کو اِذن (رخصت) عنایت ہو گی کہ وہ مؤمنین، صالحین کے لیے جو اس روز توبہ کر کے اپنے ربّ کے حضور حاضر ہوئے ہوں، مغفرت کی دعا کریں۔ اس طرح شفاعت کے تمام باطل تصورات کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

11 سورۃ النحل

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (102:16)

کہہ دیجیے کہ اس کتاب (قرآنِ مجید) کو تمھارے ربّ کی جانب سے حق کے ساتھ، روح القدس (جبریلِ امین) لے کر آئے ہیں۔

12 سورۃ الشعراء

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (193-192:26)

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ قرآن ربُّ العالمین کا اتارا ہوا ہے جسے

Marfat.com

روح الامین لے کر آئے ہیں۔

ان دونوں آیات میں اور ان سے ماقبل کی متعدّد آیات میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ روح یا الرّوح سے ملائکہ اور جبریلِ امین یعنی حاملینِ امرِ ہدایت اور امرِ تکوین ہی مراد ہیں۔ فلاسفہ اور صوفیا جس روح کے اثبات میں پریشان ہیں، ان تمام آیات میں اس روح کا ہونا کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔

13 سورۂ القدر

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا (4:97)

اس رات میں ملائکہ اور جبریلِ امین اترتے ہیں۔

عیاں ہے کہ یہ تذکرہ اس رات کا ہے جس رات میں قرآنِ حکیم کا نزول شروع ہوا۔ پھر رمضان کی اسی باقدر اور بابرکت رات میں ہر سال جشنِ نزولِ قرآن منانے میں ایک طرف مؤمنین صالحین اپنے روزوں، نمازوں اور تلاوتِ قرآن کے علاوہ تراویح میں دورۂ قرآن کا اہتمام کرتے ہیں اور ان کے ثباتِ قلب کے لیے ملائکہ بھی ان کی رگِ جان سے قریب آجاتے ہیں۔

14 سورۂ النحل

اس آیت اور اس کے بعد درج کی جانے والی دیگر دو آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے اپنے رسولوں (ملائکہ) کے ذریعے جس طرح امرِ ہدایت نازل کرنے کا اہتمام فرمایا ہے، اسی کا ذکر ہے:

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ (2:16)

وہی اپنے حکم سے فرشتوں کو وحی دے کر اپنے بندوں میں سے جس کی طرف چاہتا ہے بھیجتا ہے کہ لوگوں کو اس بات سے آگاہ کر دو کہ میرے یعنی اللہ کے سوا کوئی اور اِلٰہ (مختارِ کل) نہیں، پس تم مجھ سے ڈرتے رہو۔

15 سورۂ المومن

يُلْقِى الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (15:40)

اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے الرّوح کو (جبریل

Marfat.com

امین کو وحی دے کر) بھیجتا ہے۔

16 سورۃ الشوریٰ

اس آیتِ مبارکہ میں وحیِ ہدایت، وحی بذریعہ جبریلِ امین کی ساری حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے اور صلصلۃ الجرس وغیرہ دیگر خود ساختہ وحی کے طریقوں کی مکمل نفی ہے، جن کے ذریعے کشف اور مجہول حرف وصوت کے حامل پیغامات کو وحی کا ہم پلّہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یا جیسا کہ ایک فاترالعقل بارہ سالہ یہودی بچے کی کہانی گھڑ کر یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ مجذوب صاحبِ کشف ہو سکتا ہے، اور معاذ اللہ نبی e اپنی ساری تگ و دو کے باوجود کشفِ اسرار کی صلاحیت سے محروم رہتے ہیں:

وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (52:42)

اور اسی طرح ہم نے آپ کی جانب اپنے حکم سے ایک روح (امرِ ہدایت۔ کتاب) وحی کی صورت بھیجی۔

یہ تذکرہ ہے وحیِ قرآن بذریعہ جبریلِ امین کا اور اس سے پہلی آیت میں یہ بتا دیا ہے کہ رسولوں کے ذریعے وحی کا یہی ایک طریقہ ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (51:42)

اور کسی بشر کی یہ تاب نہیں کہ اللہ سے اس کے دوبدو ہو کر کلام کرے (اس میں استثنا وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا کا بھی نہیں ہے کہ وہاں بھی کلام دوبدو نہیں) مگر یہ کہ وحی کے ذریعے بات کرے یا من ورای حجاب (ان دو صورتوں کے علاوہ اور ان کے ساتھ تیسری صورت جو رسولوں کے ساتھ عام ہے کہ) اپنا ایک رسول بھیجے (فرشتہ، حاملِ وحی، حاملِ امرِ ہدایت) پس وہ اللہ کی منشا سے، جو اللہ چاہے، وہ وحی کر دے۔ اور بے شک اللہ عالی شان اور حکمت والا ہے۔

17 سورۃ بنی اسرائیل

اوپر دی گئی تمام آیات سے بخوبی معلوم ہو گیا کہ روح سے مراد ملائکہ (حاملینِ امرِ ربّ) یا خود امرِ ربّ ہے اور الرّوح سے مراد جبریلِ امین کی ذاتِ والا صفات ہے جو بالخصوص حاملِ امرِ ہدایت ہونے کے رتبۂ جلیلہ پر سرفراز رہی۔ وہ جبریلِ امین جو شدید القویٰ ہے، ذو مرّہ ہے

Marfat.com

(جس کی جسمانی اور روحانی طاقتیں بے بہا ہیں) اور جو انبیا کا معلم ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت الرّوح کے بارے میں کلیدی آیت گنی جاتی ہے اور الاّماشاء اللہ سبھی علما بالخصوص صوفیہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس آیت میں اُسی روح کا ذکر ہے جو انسانی بدن سے باہر بھی ایک مکمل وجود رکھتی ہے اور جس کی قوتیں ملائکہ سے بڑھ کر ہیں۔ حالانکہ ان آیات کی محض تلاوت سے ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں بھی سارا بیان امرِ ہدایت ہی کا ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۚ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (85:17)

اور یہ لوگ آپ سے الرّوح کے بارے میں پوچھتے ہیں ان سے کہہ دیجیے کہ الرّوح میرے ربّ کا حکم ہے۔

ان ابتدائی الفاظ کے بعد ارشاد ہوا:

اے مشرکین واہلِ کتاب! تم اس حاملِ وحیِ الٰہی کے بارے میں سوال کرتے ہو، جس کی ذات سے تم آگاہ نہیں ہو سکتے۔ یہ مرتبہ و مقام تو اللہ کے رسولوں کا ہے جن تک الرّوح۔۔ جبریلِ امین۔۔ آتے ہیں اور ان پر وہ کتاب نازل کرتے ہیں جو نورِ ہدایت ہے، علم ہے اور تمھیں تو بہت کم علم دیا گیا ہے (تمھارا تو کیا مذکور ہم اس نبیٔ رحمت کو جو علم دے رہے ہیں اور جس طرح الرّوح کی معرفت انھیں امرِ ہدایت سے نواز رہے ہیں، اس کا معاملہ بھی یہ ہے کہ) اگر ہم چاہیں تو اے نبی ہم آپ ﷺ سے بھی وہ سب اٹھا لے جائیں جو ہم نے آپ ﷺ پر وحی کیا ہے۔ پھر آپ ﷺ نبی ہوتے ہوئے بھی (اس محرومی سے بچنے کے لیے) ہمارے مقابل اپنا کوئی حمایتی نہ پائیں گے۔ ہاں مگر (یہ امرِ ہدایت بذریعہ الرّوح آپ پر نازل کرنا) آپ ﷺ کے ربّ کی جانب سے رحمت کا معاملہ ہے (تمام بنی نوعِ انسان کے لیے اور آپ کے لیے بھی) بے شک آپ پر اللہ کا بے پایاں فضل ہے۔ اور کہہ دیجیے کہ اگر انسان اور جن مل کر اس قرآن کی (جو الرّوح کے ذریعے نازل ہوا) مثل بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے خواہ ایک دوسرے کی مدد میں کتنے ہی سرگرداں کیوں نہ ہوں۔

آیت 88 تک کا مفہوم ان الفاظ میں بیان ہوا حالانکہ اس کے بعد آیت 98 تک سارا بیان ہی رسولوں اور کتابوں اور ہدایت کے بارے میں ہے۔ جو لوگ الرّوح (نزولِ کتابِ ہدایت بذریعہ جبریلِ امین) کو ماننے سے انکار کرتے ہیں، وہ الکتاب کی بجائے انبیا سے اپنی

Marfat.com

پسند کی نشانیاں مانگنے لگ جاتے ہیں حالانکہ ارشاد ہوا کہ نبی تو بس ایک بشر ہے، اللہ کا بھیجا ہوا (هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا۔ 93:17) اور انھی میں وہ بد بخت بھی ہیں جو اپنے آپ کو الرّوح سے، کتاب سے اور نبی کی ذات سے مستغنی سمجھتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست، اپنے کشف کے ذریعے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھی بزعمِ خود اللہ کے چہیتوں کے لیے یہ آیۂ مبارکہ نازل ہوئی ہے کہ تم الرّوح کو نہیں مانتے، مُعلّمُ الرُّسُل ہونے کے باوجود اس کو حقیر جانتے ہو اور اپنے خود ساختہ علم پر نازاں ہو، حالانکہ

وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (85:17)

تمھیں تو بس تھوڑا سا ہی علم حاصل ہو سکتا ہے

18 سورۂ الحجر، آیت 29

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي (29:15)

پھر جب میں اسے بنا سنوار لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں۔

سورۂ الحجر کی یہ آیت اور دیگر دو آیات میں انسان میں روح پھونکنے کا تذکرہ ہے۔ ان الفاظ سے یہ اشتباہ ہو سکتا ہے کہ روح کوئی خاص شے ہے۔ یقینا ہے اور یہی وہ امرِ تکوین ہے جو انسانی جسد کو حیات اور تحرّک بخشتا ہے۔ اگر یہ روح کوئی الگ حقیقت ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس طرح فرماتا کہ دیکھو میں نے آدم کا پُتلا بنا لیا ہے اب میں اس بشر (آدم) کی وہ روح جو میں نے پہلے سے الگ بنا کر اپنے عالمِ مثال میں رکھ چھوڑی ہے، اسے اس پتلے میں داخل کر دیتا ہوں۔ قرآن کی کسی آیت سے یہ بات ثابت نہیں کی جا سکتی۔

فرمایا یہ گیا ہے کہ میں اس میں اپنی روح داخل کرتا ہوں۔ اب اگر روح کو الگ وجود رکھنے والی کوئی شے مان لیں تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بھی ایک سے زیادہ حصے ہیں غالباً اس کا جسد بھی ہے، اس میں روح بھی ہے اور شاید اس کا نفس بھی ہو گا!!!

منصور حلاج (المتوفّٰی 922ء) کا کہنا ہے کہ خدا کی ذات میں ایک خدائی ذات (لاہوت) ہے اور دوسری انسانی ذات (ناسوت) ہے۔ (العیاذ باللہ)

علامہ ابنِ جوزی نے مِن رُوحی کے بارے میں لکھا ہے:

"اللہ کی صفات میں سے کوئی صفت رُوح نہیں جو لوگ مضاف کو صفت قرار

Marfat.com

دیتے ہیں، وہ نئی بات نکال رہے ہیں۔" (ابن تیمیہ از ابوزہرہ، ص 273)

19 سورۂ ص

اس آیتِ مبارکہ (72:38) کے یہ الفاظ بھی بعینہٖ سورۂ الحجر آیت 28 والے الفاظ ہیں۔ ان الفاظ میں وہی حقیقتِ کبریٰ واضح کی جارہی ہے جو ساری کائنات کے بارے میں دیگر مقامات پر مختلف الفاظ کے ذریعے ظاہر کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مخلوق کو بنانے کے بعد اس کا وظیفۂ حیات اس میں داخل کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (12:41)

ہر آسمان میں اس کا متعلقہ حکم القا کر دیا۔

اس آیت کی روشنی میں یہ وہم بھی دور ہو جانا چاہیے کہ روح چونکہ امرِ ربّ ہے اس لیے اس کو فنا نہیں کیونکہ سب جانتے ہیں جب قیامت برپا ہوگی تو زمین و آسمان سب کے سب ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، اپنے اپنے وظیفۂ حیات سے محروم، امر اللہ سے تہی، مُردہ جسدِ انسانی کی طرح بے حیثیت!!

20 سورۂ السجدہ

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ○ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (9-7:32)

وہی ذاتِ پاک ہے جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا۔ پھر منی جیسے حقیر پانی کے جرثومے (سُلالہ) سے اس کی نسل چلائی۔ پھر (انسان کے لوتھڑے کو) بنایا سنوارا اور اس میں اس کی روح داخل کی اور تمھارے لیے سمع و بصر اور فواد (قلب و ذہن) بنائے، پھر بھی تم اس کا کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔

اس آیت میں رُوحِہٖ میں ہ کی ضمیر سوّاہُ اور فیہِ کی ضمائر کی طرح انسان ہی کی طرف راجع مانی چاہیے تاہم اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انسان کی روح کہیں پہلے سے موجود تھی جسے لا کر ڈال

Marfat.com

دیا گیا۔ اس طرح وَاَوْحٰی فِی کُلِّ سَمَاءٍ اَمْرَھَا میں ھا کی ضمیر سماء کی طرف راجح ہے تو کیا یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ ہر سماء کا اپنا امر ہے۔ ہرگز نہیں امر تو اللہ ہی کا ہے اور ہوسکتا ہے۔ اس کا معنی فقط یہی ہے کہ ہر آسمان کا اور اسی طرح ہر انسان کا امر، اس کی روح، ہر انسان کی الگ الگ شناخت، الگ صلاحیتوں، الگ احساسات، اس کے اپنے کوائف اور اس کی اپنی حدود و قیود اور امکانات کو محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اعضا و جوارح سے لے کر عقل و ہوش اور جذبات و کیفیات تک میں دوسروں سے الگ اور ممتاز حیثیت عطا کرتا ہے۔ اسی کا اظہار اَمْرَھَا اور زَوْجِہٖ میں موجود ہے۔ آج ہم اس شے کو جس میں ہر نفس کی اصل موجود ہے DNA کے نام سے جانتے ہیں۔

مزید وضاحت کے لیے اسی آیت میں ارشاد ہوا کہ تمھیں اپنا اپنا سمع و بصر اور فواد عطا ہوا۔ فواد مشتمل ہے عقل و ہوش اور جذبات و احساسات پر۔ (قلب و ذہن پر) اللہ تعالیٰ نے اسی مرحلے کو ان الفاظ میں بھی بیان کیا ہے:

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (14:23)

شاہ رفیع الدّین رحمۃ اللہ علیہ ان الفاظ کا ترجمہ اور تفسیر اس طرح کرتے ہیں:

''پھر ایک دوسری صورت بنا کر اس کو نکالتے ہیں۔ تب اس میں حرکت واضطراب اور سمع و بصر پیدا ہوئے۔''

واضح رہے کہ سورۂ المومنون کی ان آیات میں نئے تخلیق ہونے والے انسانی جسد کے بارے میں پہلے سَوّٰاہُ کی تفصیل یہاں بیان ہوئی۔ (نطفہ سے علقہ پھر مضغہ پھر اس میں ہڈیاں اور ان پر گوشت چڑھانے کا عمل) اس تمام تفصیل کے بعد جس عمل کو سورۂ السجدہ کی آیت 9 میں نفخِ روح کہا گیا ہے، اسی کو اس آیت (14:23) میں خلقِ آخر کے نام سے پکارا گیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں: نطفہ ہونے کی صورت میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا آدمی بن جائے گا، اسی کو کہا دوسری مخلوق کی صورت !!

Marfat.com

نفس کی حقیقت

حسن عسکری ہمارے ملک کے ان دانشوروں میں سے تھے جو اپنی دانست میں مغرب کی پھیلائی ہوئی گمراہوں سے نالاں رہے اور عالمی تصوف بالخصوص ابنِ عربی کے افکار کی ترویج کے لیے کوشاں ہوئے۔ آپ سلسلہِ شاذلیہ کے بزرگوں احمد العلوی، ابوبکر سراج دین اور عیسیٰ نورالدّین کے بہت بڑے مدّاح تھے۔ روح اور نفس کے بارے میں مغربِ جدید کے عقائد پر آپ کا تبصرہ بہت خیال انگیز ہے:

> ''یونانی فلسفی روح کی حقیقت سے آگاہ نہیں تھے۔ اس لیے روح اور نفس کو ایک دوسرے سے ملا دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سترھویں صدی کے بعد سے تو مغرب اس فرق کو بالکل بھول گیا ہے۔ یہاں تک کہ مغربی لوگ عقل کی طرح روح کے معنی ذرا بھی نہ سمجھ سکے بلکہ نفس کو روح خیال کرتے ہیں۔۔۔ یونانیوں کے ہاں روح یا عقلِ کلّی کے لیے لفظ تھا Nous آج کل اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ذہن Mind۔ نفس کے لیے یونانی لفظ تھا Psyche۔ اس لفظ کو بھی آج کل ذہن کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ پھر روح کے لیے لاطینی لفظ تھا Spiritus۔ آج کل مغربی زبانوں میں لفظ Spirit انگریزی لفظ Soul کے مترادف سمجھا جاتا ہے جس کے معنی ہیں نفس۔ غرض پچھلے تین سو سال سے مغرب نفس کو ہی روح سمجھ رہا ہے''۔ (جدیدیت، صفحہ 24)

حسن عسکری کی اس عبارت سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یونانی فلاسفہ نے روح اور نفس کے سلسلے میں جو غلطیاں کی تھیں، اب وہی گمراہیاں پچھلے تین سو برس سے مغرب میں پھر سے مقبول

Marfat.com

ہوگئی ہیں۔ گویا اس دوران میں مسلم فلاسفہ اور صوفیا کے ہاں روح اور نفس کی تفہیم میں کوئی مغالطہ نہ تھا۔ اسی بات کو حسن عسکری نے واضح الفاظ میں بھی بیان کر دیا ہے:

''نہ صرف اسلامی علوم میں بلکہ سارے مشرقی ادیان میں دل سے مراد ہے عقلِ کلّی۔ علاوہ ازیں ہمارے ہاں نفس، روح اور جسم کے درمیان کی چیز ہے اس لیے نفس میں عقلِ جزوی بھی شامل ہے اور ہوا و ہوس بھی''۔ (جدیدیت، صفحہ 46)

حسن عسکری کے ان الفاظ میں چند دعوے کیے گئے ہیں:

1 اسلامی علوم میں جن اُمور پر اتفاق ہے وہ یہی افکار ہیں۔

2 دل (ہم اس سے مراد لے سکتے ہیں قرآنِ حکیم کی اصطلاحات یعنی قلب اور فواد) سے مراد ہے عقلِ کلّی

3 نفس، روح اور جسم کے درمیان کی شے ہے۔

4 اس توضیح کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ نفس، روح اور جسم تینوں الگ الگ ہیں۔ نفس سے روح اور روح سے نفس مراد نہیں لے سکتے۔

5 نفس میں عقلِ جزوی بھی شامل ہے (یعنی دل، قلب، فواد کا سفلی حصہ) اور ہوا و ہوس۔

اس کے ساتھ ساتھ حسن عسکری جرمن فلسفی دیکارت کی اس حرکت سے بھی نالاں ہیں کہ اس نے روح اور مادے کو (انسان کے جسم اور روح کو) دو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا جو ایک دوسرے سے آزاد اور خود مختار ہیں۔ (جدیدیت، صفحہ 44)

حسن عسکری کے یہ تمام دعوے نہ تو قرآنِ حکیم میں بیان کردہ حقائق کے مطابق ہیں، نہ ہی مسلمان حکماء اور صوفیاء کا دامن یونانی فلاسفہ کی گمراہیوں سے پاک دکھائی دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ مغربِ جدید پر حکم لگانے سے پہلے صوفیا کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا حساب لینا ضروری ہے۔

دورِ جدید کے وہ مسلمان دانشور بھی جو بہ ظاہر تصوف سے نالاں ہیں، اپنا فیصلہ صادر کرنے سے پہلے قرآنِ حکیم کی بات پر غور کرنا پسند نہیں فرماتے۔ مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ نے ''تزکیۂ نفس'' پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے تاہم ایک اور مقام پر نہایت بلند آہنگ میں اپنا فکر بیان کرتے ہوئے روح اور نفس کو مترادف الفاظ (باہم دگر ایک ہی) قرار دینے

Marfat.com

سے باز نہیں آئے:

''ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری اپنی روح ہے، ہم اس کے تزکیہ اور تطہیر کے ذمہ دار ہیں، جس کے لیے ہم جدّوجہد کر رہے ہیں''۔ (فلسفے کے بنیادی مسائل، امین احسن اصلاحی صفحہ 197)

یہی وہ غلط فکر ہے جس نے قرآن پاک کی دو قطعاً الگ، اپنی اپنی جگہ مستحکم، اپنے اپنے الگ معانی متعین کرنے والی اصطلاحات (روح اور نفس) کو ایک قرار دے کر تفسیر بالرّائے کی سینکڑوں راہیں ہموار کر دیں۔ یہ گمراہی آج کی بات نہیں ہے۔ جب سے یونانی فلسفے کا رعب اور دبدبہ، مسلمان حکما کے دلوں پر طاری ہوا اور انھوں نے با جماعت (یوں کہہ لیں کہ بالا جماع) قرآنی فکر سے راہِ فرار اختیار کی ہے تب سے یہی ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ علامہ ابوالقاسم سہیلی نے ''روض الانف'' میں ارشاد فرمایا ہے:

''روح اور نفس شے واحد ہے۔ تغایر بوجہِ اوصاف کے ہے۔ باعتبار اوّلیت کے تو روح ہے۔ جب فرشتہ ماں کے پیٹ میں پھونکتا ہے، روح ہے۔ جب پیدا ہوتا ہے اور کسبِ اخلاق و اوصافِ حمیدہ یا ذمیمہ کرتا ہے اور بدن سے عشق و محبت پیدا کر لیتا ہے اور مصالحِ بدن میں مشغول ہو جاتا ہے تو اس پر لفظ نفس بولا جاتا ہے''۔ (بحوالہ دلائلُ السّلوک 58)

مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب حیاتِ برزخیہ میں انھی افکار سے استفادہ کیا ہے اور جس امر کو حسن عسکری نے مغربِ جدید کی گمراہیوں میں شامل سمجھا ہے اور وہی بات صدیوں پہلے سے مروّج مسلمان صوفیا کے فکر سے بھی مترشح ہے، اسی کی بازگشت پوری شدّومد سے مولانا اللہ یار خان اور دیگر علما کی تحریروں میں ملتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''معلوم ہوا کہ روح اور نفس شے واحد ہے۔ اوصاف بدلنے سے نام بدلے مگر نام بدلنے سے ذاتِ شے نہیں بدلتی''۔ (صفحہ 232)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''روح کی نسبت جب ذاتِ باری کی طرف ہوتی ہے تو اسے روح سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب بدن سے مالوف ہو جاتا ہے، کسبِ اکتساب

Marfat.com

کرتا ہے تو نفس سے موسوم ہوتا ہے اور برزخ اور جنت میں جب کھانے پینے کی نسبت اس کی طرف کی جاتی ہے تو نسمہ سے موسوم ہو جاتا ہے۔ چیز واحد ہے۔ روح خود مجسّم ہے ۔انسانی بدن کی شکل پر ہوتا ہے، کھاتا پیتا ہے"۔(صفحہ 252)

ہم محض صوفیا کو یہ الزام نہیں دے سکتے کہ وہ اس طرح قرآنی اصطلاحات سے کھیلتے رہے ہیں، ثقہ مفسرینِ قرآن اور ماہرینِ لغتِ عرب نے 150 ہجری سے بھی کہیں پہلے، یونانی فلسفے کی پیروی کرتے ہوئے یہی حکم لگا دیا تھا ۔مقاتل بن سلیمان یمنی ایرانی مفسرِ قرآن کہلاتے ہیں (المتوفی 150ھ) آپ اپنی کتاب الوجوہ والنّظائر میں لکھتے ہیں:

الموت: ذهابُ الروح (صفحہ 107)

وَمَا اُبَرِّیُٔ نفسی: یعنی قلبی (صفحہ 137)

النّفس: الانسان

الانفس: (اخرجوا انفسکم۔۔۔۔) یعنی روحُ الانسان وحیاتُہٗ

(اللّٰہ یتوفَی الانفس) یعنی الانسان حیاتُہٗ اذا قبضت روحُہٗ

(انسان اور اس کی زندگی جب اس کی روح قبض کر لی جاتی ہے)

راغب اصفہانی (المتوفی 486ھ) نے مفردات القرآن میں موت کے معنی اس طرح لکھے ہیں: ابانۃ الروح عن الجسد (روح کا جسد سے نکل جانا) اور المنجد (لغت) میں لکھا ہے: اذا فارقت الروح جسدہٗ (جب روح اپنے جسم سے جدا ہو جائے۔)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم میں انسانوں (اور حیوانوں کی بھی) موت کا کئی جگہ ذکر ہے۔ کسی ایک مقام پر بھی روح کے جسد سے نکل جانے کا تذکرہ نہیں۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ اصحابِ لغت دوسری صدی ہجری سے لے کر تا حال اور فلاسفہ وصوفیا بھی ہر جگہ، روح کے جسم سے نکل جانے کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس بات کو عین منشائے قرآنی سمجھتے ہیں! اسکا جواب مولانا اللہ یار خان اس طرح دے رہے ہیں:

"ان دونوں آیتوں میں (یتوفّی الانفس حین موتھا......اور اَخرِجُوْا اَنْفُسَکُمْ میں) ذکر نفس کا ہے اور مراد روح ہے۔ جمہور علما بھی

Marfat.com

نفس اور روح کے اتحاد کے قائل ہیں"۔(دلائل السلوک صفحہ 57)

جب ایک بار یونانی فلاسفہ کے تتبع میں یہ طے کرلیا گیا کہ عالم مثال میں انسانی ارواح ایک مکمل بشری ہیئت میں اور تمام وظیفہ ہائے جسمانی کے ساتھ رہتی ہیں تو پھر یہ بھی طے پا گیا کہ تخلیق کے وقت انسانی جسد میں وہ جسدِ مثالی (روح) داخل کر دی جاتی ہے اور موت کے وقت اسے واپس نکال لیا جاتا ہے۔مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

"جس وقت انسان مرتا ہے، پہلے اس عالم مثال ہی میں جاتا ہے۔وہاں ایک آسمان بھی ہے، مشابہ دنیا کے آسمان کے اور زمین بھی ہے مشابہ دنیا کی زمین کے اور ایک جسم بھی ہے مشابہ اس جسم کے"۔(اشرف الجواب،607)

اور ان فاضلانہ، حکیمانہ باتوں کو عین قرآنی فکر ثابت کرنے کے لیے یہ دعویٰ بہرحال ضروری تھا کہ "روح اور نفس شے واحد ہے"۔۔۔اللہ تعالیٰ کہنا یہ چاہتا تھا کہ میں "ارواح کو قبضے میں لیتا ہوں" لیکن (نعوذ باللہ غلطی سے) کہہ گیا کہ "میں نفوسِ انسانی کو اپنے قبضے میں لے لیتا ہوں"۔اللہ تعالیٰ کا ارادہ تو یہ کہنے کا تھا کہ "اپنی روحیں اپنے بدنوں سے نکال باہر کرو" لیکن (نہ جانے کس مجبوری کے تحت) اللہ کو یہ کہنا پڑ گیا کہ "اپنے نفوس کو خارج کرو"۔(نعوذ باللہ من ذالک)

اب ایک طرف صورتِ حال یہ ہے کہ مولانا اصلاحی جیسا شخص بھی تزکیۂ نفس کی جگہ "تزکیۂ روح" لکھنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا اور ساتھ ہی یہ تاثر بھی دے رہا ہے گویا روح کوئی الگ، جیتی جاگتی شے ہے اور بدن کے ساتھ منسلک ہوتے ہوئے بھی اس سے جدا ہے:

"ہماری اپنی روح ہے، ہم اس کے تزکیہ اور تطہیر کے ذمہ دار ہیں"

(حوالہ سابقہ)

اس طرح مولانا اصلاحی بھی تصوف کے بڑے بڑے ناموں اور ان کی جانب سے کی گئی تعبیرات سے مرعوب ہو گئے۔صدیوں پہلے ابونصر سراج (المتوفیٰ 378ھ) نے فرمایا تھا:

"تمام ارواح مخلوق ہیں۔۔۔اللہ نے آدم کی روح کو ملکوت سے اور جسم کو مٹی سے بنایا تھا"۔(کتاب اللمع۔باب 152)

مٹی سے انسان کی تخلیق، یہ دعویٰ تو قرآنِ حکیم میں موجود ہے، دوسری خبر کے لیے معلوم ہوتا ہے کہ ان صوفیا کی خانقاہوں میں خود ذاتِ الٰہی کا ورود ہوتا رہا ہے تبھی اتنے تیقن کے ساتھ

Marfat.com

ایک ایسا دعویٰ کر دیتے ہیں کہ جس کا نہ سر ہے نہ پیر۔۔۔نہ کوئی آگا، نہ پیچھا۔۔!! (لاحول ولاقوۃ الّا باللہ)

روح اور نفس کو شے واحد قرار دے کر ان اصحابِ فضیلت نے قارئینِ کتابُ اللہ کو اس اُلجھن میں ڈال دیا کہ وہ کہاں روح کے معنی روح سمجھیں اور کہاں روح کے معنی نفس یا نفس کے معنی روح۔ اب لگے مفسرینِ کرام پینترے بدل بدل کر اپنے مخصوص افکار کو تفسیرِ قرآن کا روپ دینے!

اللہ تعالیٰ صاف سیدھے انداز میں، عربیٔ مبین میں یہ فرماتا ہے کہ اللہ نفوسِ انسانی کو ان کی موت کے وقت، یا جب وہ سو رہے ہوں، اپنے قبضے میں لے لیتا ہے کہ سویا ہوا شخص بھی (کسی مُردہ کی مانند) اپنے جسد پر قادر نہیں رہتا۔ پھر اگر کسی سوئے ہوئے شخص کی مدتِ حیات ابھی پوری نہ ہوئی ہو تو اسے اپنی اجل تک کی مہلت دے دیتا ہے۔

آیت 42:39 کی یہ ترجمانی عربی زبان وادب کے عین مطابق بھی ہے اور منشاءِ قرآنی کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ اس لیے کہ قرآنِ حکیم میں سینکڑوں بار نفس کی اصطلاح آئی ہے اور ہر جگہ ''ذات / شخصیت'' کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اسی طرح اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَکُم میں بھی ملائکہ ،اللہ کے باغیوں، لاف زنی کرنے والوں سے کہیں گے کہ اب اپنا آپ دکھاؤ ،اب وہی متکبّرانہ روّیہ دکھاؤ تو جانیں! اب اپنے اندر کا خُبث ظاہر کرو تو دیکھیں!!

امام شوکانی صاحبِ تفسیر فتح القدیر نے بھی یہی مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ملائکہ یہ کہیں گے کہ اب تم ہمارے ہاتھوں سے یا سکراتِ موت سے بچ کر دکھاؤ''!!

ہم سمجھتے ہیں کہ تصوف محض دو باتوں پر قائم ہے۔ ایک طرف حدیثِ احسان ہے اور اس کے الفاظ کانک تراہ کی من مانی تعبیر (حالانکہ یہ روایت کہیں سے بھی حدیث ثابت نہیں ہوتی۔ امام ذہبی نے اسے منکرات میں شمار کیا ہے۔) اور دوسری طرف سورۃ الزّمر کی آیت 42 میں نفس کا ترجمہ ''روح'' کر دینے کے بعد خواب کی کیفیت کے بارے میں لایعنی دعاوی!!

ان تمام دعووں کے علی الرغم (جن کی حقیقت ذیل میں بیان ہوگی) ہمارا بفضلہٖ یہ دعویٰ ہے کہ روح بس امر اللہ ہے، (امرِ تکوین یا امرِ ہدایت)، اس کا الگ سے کوئی وجود نہیں اور ''نفس'' کی اصطلاح انسان کی مکمل ذات کے لیے مستعمل ہے۔ یہی بات سیّد علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے

Marfat.com

کشف المحجوب میں بتائی ہے:

''جان لو کہ نفس لغت کی رو سے کسی چیز کے وجود، اس کی حقیقت اور اس کی ذات کو کہتے ہیں''۔ (صفحہ 292)

سورۃ الزّمر کی آیت اللہ یتوفّی الانفس ۔۔۔۔ میں نفس کے خود ساختہ معنی قرار دینے کا صوفیا نے خوب فائدہ اٹھایا۔ فرماتے ہیں کہ خواب کے دوران میں روح انسان کے جسد سے باہر نکل جاتی ہے (حالانکہ آیت میں نفس کی اصطلاح آئی ہے) اور جو کچھ انسان دیکھتا اور کرتا ہے، یہ سب روح پر گزرنے والے حقیقی واقعات ہیں ۔۔ اس لیے کہ روح کا الگ وجود ہے، وہ بھی زندہ انسان کی طرح چلتی پھرتی، سنتی دیکھتی اور بولتی ہے گویا انسان کی ''مثال'' ایک الگ مکمل انسان ہے۔ نہیں بلکہ انسان سے بالاتر ہے اس لیے کہ نہ زمین اس پر اثر انداز ہوتی ہے، نہ زمان! ہواؤں میں اڑتی ہے، پلک جھپکتے میں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر لیتی ہے۔ ملاءِ اعلیٰ تک اس کی پہنچ ہے بلکہ ایک جست میں ذاتِ الٰہی کا دیدار کر لیتی ہے۔ خواب کی حقیقت پر غور کیے بغیر ایسے دعوے، داستانِ الف لیلہ سے کسی طرح کم نہیں۔ اور ان دعووں کی بنیاد، ان کا منبع کیا ہے ۔۔ فقط یہ مغالطہ آرائی کہ روح خواب میں بدن سے الگ ہو جاتی ہے۔ جبکہ آیۂ مبارکہ یہ بتا رہی ہے کہ اللہ انسان کے مکمل وجود، اس کے نفس کو اپنے قابو میں لے لیتا ہے۔

صوفیا کا دعویٰ یہ ہے کہ خواب گہری نیند کے دوران میں آتے ہیں یعنی جب روح بدن سے الگ ہو جاتی ہے اور جسدِ انسانی کی مثال محض ایک مُردے کی سی ہو جاتی ہے۔ حالانکہ سائنسی تحقیق ہمیں یہ بتاتی ہے کہ گہری نیند میں خواب کبھی نہیں آتے ۔ خواب اس وقت آتے ہیں جب انسان سونے جاگنے کی درمیانی حالت میں ہوتا ہے۔ بیرونی اثرات کو قبول کرتا ہے، محسوس کرتا ہے۔ کوئی آواز کانوں میں پڑ گئی، جسم کے کسی حصے پر سردی محسوس ہوئی، تیز روشنی نے پردۂ بصارت میں تحریک پیدا کی وغیر ذالک۔ گویا ''جان'' پوری طرح فعّال اور متحرک رہتی ہے تبھی یہ بیرونی اثرات یا دن بھر کی سوچ یا پھر عمر بھر محسوس کی گئی خوشیاں یا اذیتیں، انسانی ذہن کی کارفرمائیوں کے تحت خواب کی کیفیات میں ڈھل جاتی ہیں۔ روسی ماہرِ نفسیات ''روخلن'' نے سینکڑوں سائنسدانوں کے ہزاروں تجربات کا نچوڑ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''خواب صرف اس وقت آتے ہیں جب نیند گہری نہیں ہوتی۔ جو لوگ

Marfat.com

تھا اور جب ہم چاہتے انھی جیسے لوگ ان کی جگہ بدل دیں۔

اس آیت میں کفار کے یوم آخرت کو نہ ماننے کے بیان کے بعد تعبیرات کہی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ حیات بعد الموت میں انسان کا بدن ایسا بدن نہیں ہوگا۔ کوئی اور تبدیل شدہ بدن ہوگا۔ وہ تبدیل شدہ بدن سزا کا حقدار کیسے ہو گیا! لازم ہے کہ انسان کی اصل۔ اس کا نفس الگ سے زندہ سلامت موجود ہو جو سزا و جزا کے لیے نئے بدن میں ڈال دیا جائے۔

الجواب: اولاً تو اس آیت کی یہ تعبیر ہی محل نظر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک عمومی بات کہی ہے کہ ایسے منکرین کو ختم کر کے دوسری قوم کھڑی کر دی جائے گی۔ جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا ہے۔

ثانیاً اگر یہی مطلب لینا ہو تو اس کے لیے موزوں آیت وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ کے الفاظ تھے۔ یعنی جب انسانی نفوس کا جوڑا بنا دیا جائے گا۔ عین وہی پہلے والے انسان کا مثل۔ چنانچہ اس آیت کا یہ معنی لینا غلط ہے کہ جب روحیں جسموں سے جوڑی جائیں گی یا نفس جسم میں داخل کیے جائیں گے۔

دانشور: آیت اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ ـــــ میں توفی سے مراد ہے نفس کو بدن سے باہر نکال کر قابو میں کر لینا۔

الجواب: یہ بات قطعاً درست نہیں۔ اگر نفس نیند کی حالت میں بدن سے باہر نکل جاتا ہے تو نفس اور جسد کا (نفس اور دماغ کا) کوئی تعلق آپس میں باقی نہیں رہتا۔ اس طرح کم از کم یہ تو ثابت ہوا کہ روح یا نفس کی سیر دنیا اور سیر افلاک کا کوئی تعلق خواب سے نہیں ہے۔ یوں بھی خواب صرف اس صورت میں آتے ہیں جب انسان موت کی سی کیفیت میں نہ ہو بلکہ سوتے جاگتے کی حالت میں ہو یعنی اس کی روح یا اس کا نفس انسان کے اندر ہی موجود ہو اور دماغ سے اس کا رشتہ برقرار ہو۔

چونکہ آیت کے الفاظ میں حِينَ مَوْتِهَا مذکور ہے اس لیے ثابت ہوا کہ نفس جسے قابو کر لیا گیا ہے وہی موت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ ھا کی ضمیر نفس ہی کی طرف راجع ہے۔ حالانکہ آپ سمجھتے ہیں کہ یہی نفس (یا روح) بدن کو موت آنے پر بھی زندہ رہتا ہے اور یہی دوبارہ بدن میں لوٹایا جائے گا۔

یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس آیت میں يُرْسِلُ کا تعلق إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى سے ہے نہ

Marfat.com

کہ جسد سے (کہ اس روح کو جسد کی طرف لوٹایا جاتا ہے) جیسے گزشتہ اقوام کو مہلت دینے کے معاملے میں بارہا مذکور ہے۔ اس بات کا کوئی قرینہ موجود نہیں کہ کسی شے کو واپس بدن میں بھیجا جاتا ہے۔

دانشور: وَنَفۡسٍ وَمَا سَوّٰهَا میں نفس سے مراد وہ لطیف عنصر ہے جسے فجور و تقویٰ سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

ایوبی: نفس سے مراد ہے انسانی ذات/شخصیت۔

تسویہ کے بارے میں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ قرآن میں یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے کسی ٹھوس مادی شے کو بنانے، سنوارنے، سجانے کے لیے آیا ہے۔ جیسے زمین و آسمان کے بارے میں فرمایا: فَسَوّٰهُنَّ اور انسانی جسد کے بارے میں ارشاد ہوا: بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ۔ اس آیت میں انسان کی پور پور۔ ہر ایک پور کی درستگی، اس کے تسویہ کا واضح ذکر ہے اور یہی آیت گویا کہ وَنَفۡسٍ وَمَا سَوّٰهَا کا تفصیلی بیان بھی ہے۔

دانشور: انسان کی تخلیق سے پہلے اس کا نفس (یا اس کی روح) زندہ سلامت موجود ہوتی ہے جسے خلق کے وقت انسانی جسد میں ڈال دیا جاتا ہے۔ بنا بریں وَلَمۡ تَکُ شَیۡئًا سے یہ مراد نہیں کہ کچھ بھی نہ تھا بلکہ اس کے معنی ہیں کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔

ایوبی: عام طور پر سورۂ دہر کی آیت وَلَمۡ یَکُنۡ شَیۡئًا مذکورًا کا جو غلط معنی لیا جاتا ہے اسی کو آپ نے مزید غلطی کرتے ہوئے وَلَمۡ تَکُ شَیۡئًا پر بھی چسپاں کر دیا ہے۔

حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ کوئی بہت دور، بہت پہلے کی بات نہیں ہے۔ اگلی آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ پہلے نطفہ کی سی نا قابلِ ذکر حالت میں تھا پھر اسی سے خلق ہو کر انسان جیسی عالی شان مخلوق بن گیا۔ اور اگر مَذۡکُوۡرًا کا لغوی معنی ہی مراد لیا جائے تو مطلب یہ نکلتا ہے کہ کبھی کوئی ایسی شے نہ تھا جس کا کبھی کہیں ذکر کیا گیا ہو۔ عیاں ہے کہ قرآنِ پاک میں انسان کے حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ نفس یا روح ہونے کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔ یہ سب کچھ تو بس ان روایات میں ملتا ہے جو فلسفے سے متاثر ہو کر گھڑی گئیں۔ دوسری آیت وَلَمۡ تَکُ شَیۡئًا میں اسی بات کی نفی کی گئی ہے کہ آج سے پہلے، ازل سے، کبھی کچھ نہ تھا، نہ روح تھا نہ نفس تھا، نہ مثل تھا، نہ عین تھا۔ کچھ بھی نہ تھا۔

دانشور: اگر دوبارہ زندہ کرنے پر محض نیا بدن اور نئی جان دے دی جائے گی، کوئی نفس

Marfat.com

Marfat.com

برزخ اور اوہامِ باطل

محبّی و مکرّمی ڈاکٹر مسعود الدّین عثمانی رحمۃ اللہ نے اخلاص فی العقیدہ اور اخلاص فی العمل میں جو محنت کی، راقم الحروف خود بھی کسی حد تک اس کا عینی شاہد ہے۔ یہ قبریں یہ آستانے جس طرح مراکزِ شرک بنے ہوئے ہیں اس کا سبب ڈھونڈتے ہوئے مرحوم نے مزعومہ عذابِ قبر کے باطل تصور کو عذابِ برزخ کے عنوان سے رقم کیا۔ اسی دوران میں آپ نے آیاتِ قرآنی کے درست حوالے بھی دیے ہیں اور متعدد ضعیف روایات کو حدیث ماننے سے بھی انکار کر دیا ہے تاہم آپ کا ذیل میں درج نقطۂ نظر دین کی اصل روح، قرآنی فکر کی صحیح تعبیر سے قاصر ہے۔ عثمانی صاحب نے جو کچھ لکھا، آپ کی لِلّٰہیت اور آپ کے مثبت فکر کا ثبوت ہے مگر کیا ان مصادرِ شرک کے انہدام کے لیے اَحوال بعدَ الموت کی یہ تعبیر کافی ہے! ہرگز نہیں۔ فرماتے ہیں (اور آپ کے مندرجہ ذیل جملے آپ ہی کے تصورِ برزخ کی تفصیل ہیں):

> ''یہی وہ اصل قبر ہے جہاں روح کو دوسرے (برزخی) جسم میں ڈال کر قیامت تک رکھا جائے گا اور اسی پر راحت یا عذاب کا پورا دَور گزرے گا''۔

اور لکھتے ہیں کہ (برزخ میں):

> ''ان کو کوئی دوسرا قیامت تک باقی رہنے والا اور عذاب برداشت کرنے والا جسم دیا گیا ہے، جسدِ عنصری وہ بہر حال نہیں ہے''۔

ڈاکٹر مسعود الدّین عثمانی رحمۃ اللہ بخاری کی ایک حدیث پر بحث کے بعد اپنی دانست میں درست نقطۂ نظر ان نکات میں بیان کرتے ہیں:

1 روحوں کو جسم (برزخی) ملتا ہے اور روح اور اُس جسم کے مجموعہ پر راحت و عذاب کا دَور گزرتا ہے۔
2 اس مجموعہ کو قیامت تک باقی رکھا جائے گا اور اس پر سارے حالات قیامت تک گزریں گے۔

Marfat.com

گے۔ (بنی اسرائیل 17:50) ۔۔۔۔ اجزائے جسدِ انسانی اپنی اصل حالت سے تبدیل ہوتے ہوتے کالمعدوم ہو جاتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کو نشاۃِ ثانیہ کے لیے کسی پہلے سے موجود خام مواد کی قطعاً حاجت نہیں جیسے کہ فرمایا وَّ قَدۡ خَلَقۡتُكَ مِنۡ قَبۡلُ وَ لَمۡ تَكُ شَيۡـًٔا (مریم، 9:19) ''اے انسان میں نے ہی تجھے پیدا کیا ہے حالانکہ اس سے پہلے تو کچھ بھی نہ تھا''۔۔۔۔ انسان کے لیے فقط دو موتیں ہیں یعنی جب وہ مُردہ زمین کی طرح معدوم تھا اور جب اسے طبعی عمر پانے کے بعد موت دی جائے گی اور دو ہی زندگیاں ہیں، برزخی زندگی کہاں سے آگئی!

ج) ارشادِ باری ہے: ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقۡبَرَهٗ (عبس، 21:80) ''پھر اللہ تعالیٰ اسے موت دے دیتا ہے اور پھر اسے قبر میں اتار دیتا ہے''۔۔۔۔ ان الفاظ میں قبر کا ہونا عموم کا حامل ہے اس لیے کہ صورتِ حال یہ ہے کہ بہت سوں کو قبر نصیب ہی نہیں ہوتی، مُردے جلانے اور مُردے جانوروں اور پرندوں کے حوالے کرنے کے احوال بھی ہمارے سامنے ہیں۔۔۔۔ اِسی اُلجھن کے باعث ڈاکٹر صاحب مرحوم نے پُوجی جانے والی قبر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے برزخی قبر دریافت کر ڈالی جس کی فی الاصل کوئی حقیقت نہیں ہے اور اس امر کے لیے قرآنِ حکیم اور احادیثِ صحیحہ سے کوئی دلیل نہیں ملتی۔۔۔۔ عثمانی صاحب کو سوچنا چاہیے تھا کہ قبر کے عموم کی وجہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے پیشِ نظر کچھ اور بھی ہو سکتی ہے مثلاً: سب سے پہلے انسان کی موت (بوجہِ قتلِ ہابیل) کے بعد اوّلین گروہِ انسانی کو مردہ قبر میں دفن کرنے کا طریقہ بتلایا گیا اور اس سے اِنحراف کرنے والے ہر حال میں شاذ ہی متصور ہوں گے۔۔۔۔ اور قرآن پاک کے اوّلین مخاطبین میں یہودی، نصرانی اور اہلِ عرب سب کے سب مُردوں کی قبر میں تدفین ہی پر کاربند تھے۔ چنانچہ موت کے بعد قبر کا تذکرہ بالکل فطری انداز میں کر دیا گیا ہے۔ اب اس امر کے لیے، اللہ تعالیٰ کے اس اندازِ تحریر کے لیے ہمیں بس مَا یَشَآءُ اور کَیۡفَ یَشَآءُ کے تبصرے پر ہی قناعت کرنی چاہیے۔

د) مفسرینِ قرآن کے ہاں ایک اہم اختراع وایجاد برزخ کے لیے ''مکانیت'' تلاش کر لینا بھی ہے۔ برزخ کے معنی ہیں پردہ، آڑ، روک اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے برزخ کی تعبیر کے لیے جو الفاظ قرآن میں لکھ دیے ہیں وہ اِسی معنی کا بیّن اظہار ہیں فرمایا:

مَرَجَ الۡبَحۡرَيۡنِ يَلۡتَقِيٰنِ۔ بَيۡنَهُمَا بَرۡزَخٌ لَّا يَبۡغِيٰنِ (55:19-20) ''اللہ نے چلا دیے ہیں

Marfat.com

دو دریا جو ایک دوسرے سے لگ رہے ہیں (ایک میٹھا اور دوسرا کڑوا) درمیان اُن کے ہے پردہ کہ ایک دوسرے میں نہیں ملتے''۔ مطلب یہ کہ جہاں جہاں انھیں رکھا ہے، وہیں رہتے ہیں۔۔۔ اللہ کے بنائے ہوئے اس نظام سے ''بغاوت'' نہیں کرتے۔ یوں نہیں ہے کہ اس آڑ کو، اس روک کو، اس پردے کو ہٹا کر دوسری جانب آ جائیں، یہی بات سورۃ الفرقان آیت 53:25 میں زیادہ وضاحت سے بیان کر دی: وَ جَعَلَ بَیۡنَہُمَا بَرۡزَخًا وَّ حِجۡرًا مَّحۡجُوۡرًا ''اور ان (میٹھے اور کڑوے) دونوں (پانیوں) کے درمیان پردہ اور بندھا ہوا بند بنا دیا''۔

انسان کے بارے میں برزخ کا لفظ استعمال کرتے ہوئے فرمایا:

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَہُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ رَبِّ ارۡجِعُوۡنِ (99:23) ''حتیٰ کہ جب اُن میں سے کسی کو موت آ لیتی ہے تو وہ کہتا ہے اے میرے ربّ مجھے لوٹا دے (زمین کی طرف، زندگی کی طرف)''۔

مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ موت آنے کے بعد کسی انسان کا کسی صورت اس زندگی، اس زمین کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہتا اور کسی انسان کی کیا مجال ہے کہ اس قانون سے بغاوت کر سکے۔ وَ مِنۡ وَّرَآئِہِمۡ بَرۡزَخٌ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ (المومنون، 100:23) ''اور ان (مرے ہوئے انسانوں) کے پیچھے بس ایک پردہ ہے، اُس روز تک کے لیے جب وہ اٹھائے جائیں گے''۔ گویا برزخ اسی وقفے کا نام ہے۔ دنیاوی زندگی سے آگے نکل گئے ہیں پیچھے جا نہیں سکتے۔ موت کی صورت میں ایک آڑ، ایک روک، ایک پردہ ہے جسے وہ ہٹا نہیں سکتے۔ لَا یَبۡغِیٰن۔ اس قانونِ الٰہی سے بغاوت نہیں کر سکتے۔ (دیکھیے: شاہ عبدالقادر کی تفسیر موضح القرآن)

قرآنِ کریم کے اس سارے کے سارے بیان میں کہیں بھی ''برزخ'' کے نام پر کسی مکان، مستقر اور عالم (بمعنی غلط العام جہان) کا ذکر نہیں ہے۔ ڈاکٹر عثمانی صاحب نے عالم برزخ کی اختراعی اصطلاح استعمال نہیں کی مگر ان کی دی ہوئی تمام تفصیل کسی ''جہان'' ہی کی چغلی کھا رہی ہے۔۔۔ عیاں ہے کہ پچھلی چودہ سو صدیوں میں علما نے طرح طرح کے جہان ایجاد کر لیے ہیں اور اکثریت کا یہ حال ہے کہ قرآن سے سندِ تصدیق حاصل کیے بغیر ''عالمین'' کے اس عجمی تصور کو حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں۔

۵) ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے برزخ کے لیے ایک جگہ، ایک مکان، ایک (غلط العام) عالم تلاش کر

Marfat.com

ر) ڈاکٹر عثمانی مرحوم کے ہم عصر علامہ ابوالخیر اسدی رحمہ اللہ بھی اُنھی کی طرح طرّہ فراز اور جُبّہ طراز، نئے زمانے کے ''ہاروت وماروت'' سے نالاں تھے۔ آپ نے دُرست تشخیص فرمائی کہ اِن خرافاتِ باطلہ کا مصدر، اَعیانِ ثابتہ کا افلاطونی نظریہ ہے جس کی کوکھ سے وحدۃ الوجود کے الحِاد نے جنم لیا ہے۔ آپ نے اس ''قصرِ احمر'' پر لاتعداد کاری ضربیں لگائیں مگر اس کی بنیاد ''روح'' کے جس باطل نظریے پر اُستوار ہے، اُسے جھٹلانے کی جسارت نہ کر سکے۔۔۔ ہمارے یہ دونوں محترم بزرگ بھی یہی سمجھتے رہے کہ انسانی روح، انسانی جسد سے الگ بھی اپنا ایک مکّمل وجود اور مکمل تشخّص رکھتی ہے (وہی اصل انسان ہے) اور اسی سبب اُن تمام وضعی روایات کو احادیث سمجھ کر قبول کرتے رہے جو روح کے اس باطل نظریے کی تصدیق کے لیے گھڑی گئی ہیں اور جنھیں دشمنانِ دین نے، المنافقونْ نے، باطنیہ نے گہری سازش کے تحت ہماری کتب میں داخل کیا ہے۔ جن کے مؤیّد اور مُفتری ابن سینا فلسفی، سہروردی مقتول صوفی، شیخِ اکبر ابنِ عربی اور اخوانُ الصّفا جیسے باطنی فلاسفہ رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: ''روحوں کو برزخی جسم ملتا ہے'' لیکن یہ تو درحقیقت آیۂ قرآنی: وَاِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ کی باطنی تفسیر کی گونج ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب نفوسِ انسانی کا جوڑا، ویسا ہی نفسِ انسانی (وہی مکمل شخصیت) وہی فرد بنا دیا جائے گا جیسا کہ دنیا میں تھا اور قرآن کے دیگر مقامات سے بھی یہی امر واضح ہو رہا ہے۔ مگر باطنی مفسرین کہتے ہیں: ''جب روحوں کو جسموں سے جوڑا جائے گا''۔ اللہ جانے اس قرآنی جملے میں سے فلاسفہ کی مجوّزہ روحیں کیسے برآمد ہوگئیں! بات تو نفوس کی ہو رہی ہے۔

درحقیقت باطنیّت کا سارا دارومدار الفاظ اور اصطلاحاتِ قرآنی کی من پسند تعبیر پر ہے اور یہ غلطی (جان بوجھ کر) بار بار دُہرائی جا رہی ہے کہ جہاں کہیں نفس کا لفظ آئے، باطنی معانی و مفاہیم برآمد کرنے کے لیے نفس کے معنی روح کر دیے جائیں۔

❁❁❁❁

قارئینِ کرام! اب ہم اصطلاحاتِ قرآنی کے ساتھ کیے گئے اِس مکر کو واضح کرنے کے لیے سورۃ الزّمر کی آیت 42 کی مروّجہ غلط تفسیر کا حوالہ دیں گے۔ یہی وہ باطنی معانی ہیں جن کے بل پر تصوف اور مزعومہ رویائے صالحہ اور دیگر کشف وکمالات کی عمارت قائم ہوئی

Marfat.com

ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا۔ فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْہَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰٓی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی (42:39)

''اللہ اپنے قابو میں کر لیتا ہے نفوسِ انسانی کو اُن کی موت کے وقت اور جو مرے نہیں اُنھیں ان کی نیند کے دوران میں قابو کر لیتا ہے۔ پس ان نفوسِ انسانی کو پکڑے رکھتا ہے (یعنی موت دے دیتا ہے) جنھیں موت دینے کا اس نے فیصلہ کر لیا ہو اور دوسرے (نفوسِ انسانی) کو (جن کی موت کا ابھی فیصلہ نہیں کیا) ایک وقتِ مقررہ تک کے لیے (دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے) بھیج دیتا ہے''۔

اس آیت کا ایسا ہی ترجمہ اور اسی طرح کی تفسیر شاہ رفیع الدّین اور شاہ عبدالقادر کے ہاں دیکھی جا سکتی ہے مگر جن مفسرین کی طبع پر تصوف اور وحدۃُ الوجود کا غلبہ ہے، انھوں نے اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے۔۔۔۔ اوّلاً: ''اَنْفُس'' کا معنی ''ارواح'' کر دیا، ثانیاً: کہا کہ موت کے وقت روح بدن سے الگ ہو جاتی ہے، گویا بدن مر جاتا ہے، روح کو دوام حاصل ہے (جیسا کہ اقبال نے بھی کہا ہے: ''کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے'') ثالثاً: نیند کے دوران میں بھی روح بدن سے نکل جاتی ہے، رابعاً: روح بدن سے نکل کر سیرِ دنیا اور سیرِ افلاک کرتی ہے، خامساً: اس سیر کے دوران میں روح کی دیگر انسانوں سے ملاقاتیں حقیقی ہوتی ہیں، سادساً: یہ طے کر لیا کہ ارواح کی یہ سیر دراصل خواب کے احوال ہیں مگر اسے حقیقی ملاقات پر محمول کرنا ہو گا۔ سابعاً: انسان کو نیند کے دوران میں موت نہ دینے اور دنیا میں ایک خاص معیّن مدت تک واپس بھیجنے کی بات کو بدل کر ''روح کو واپس بدن میں بھیج دینا'' بنا دیا گیا ہے۔۔۔۔ (یُرسِلُ الأخریٰ اِلیٰ اجلِ مسمیٰ) یہ باطنیہ کا طریقِ کار ہے مگر متعدّد اہلِ سنت مفسرین کے بھی یہی احوال ہیں۔ دیکھیے علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا اللہ یار خان ودیگر!

اسی طرح سورۃ الانعام (93:6) میں ارشاد ہوا کہ بدزبان اور بے لگام کُفّار کی موت کے وقت ملائکہ اُن سے کہیں گے کہ اب وہ لاف زنی کر کے دکھاؤ جو زندگی بھر کرتے رہے، اب اپنا خُبثِ باطن ظاہر کرو (دیکھیے فتح القدیر۔ شوکانی) فرمایا: اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَکُمْ (اپنا آپ ظاہر کرو)۔۔۔۔ مگر باطنی مفسرین نے یہاں بھی مکر کی انتہا کر دی، نفس کے معنی روح کر دیے اور

Marfat.com

کہا کہ فرشتے مرنے والوں سے کہیں گے: اپنی روحیں نکالو! (گویا کسی انسان کے اختیار میں ہے اپنے آپ کو موت سے ہمکنار کر لینا!)

❁❁❁❁

ہم پورے اخلاص اور للّٰہیت کے ساتھ یہی سمجھتے ہیں کہ قرآنی فکر میں عجمی افکار کی آمیزش کے لیے دشمنانِ دین نے بالخصوص باطنیہ نے اصطلاحاتِ قرآن کے من پسند معانی کا کھیل رچایا ہے۔ اسی راہ سے برزخ کو ایک جہان، ایک عالَم یعنی مکان و مستقر بنا دیا گیا۔ اسی مکر نے روح کو جو امرِ ربّ ہے، انسان کی پوری شخصیّت کا حامل، زندہ و سلامت انسان سے زیادہ باصلاحیّت، اُڑنے والا، سیرِ فلک کرنے والا بنا دیا گیا اور نفس جس کی تعبیر انسان کی ذات، انسان کی مکمل شخصیّت سے زیادہ یا کم کچھ بھی نہیں ہے، اِسی نفس کو انسانی ذات میں ایک لطیف وجود فرض کر لیا گیا۔ بس پھر کیا تھا، لطیف وجود ''نفس'' کو ایک اور لطیف وجود روح کا ہم معنی قرار دے کر، قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے جہاں نفس کہا، اس کے معنی روح سمجھ لیے گئے اور اسی میں سے برآمد ہوا کشف و کرامات اور سیرِ افلاک کا کھیل جس کا دوسرا نام تصوف ہے۔

قرآنِ حکیم میں 21 مرتبہ لفظ رُوح آیا ہے۔ 17 مرتبہ یہ لفظ بالیقین امرِ ہدایت، وحیِ الٰہی، قرآنِ حکیم کے لیے اور حاملِ قرآن جبریل کے لیے ہی ہے اور اکثر مفسرین اسی بات کی کُھل کر تائید کرتے ہیں۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوا: وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرّوحِ قُلِ الرّوحُ مِنْ اَمرِ رَبّی (17:85) ''اے نبی ﷺ! یہ لوگ آپ سے الرّوح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ الرّوح میرے ربّ کے حکم میں سے ہے''۔ یعنی صاف طور پر الرّوح کو امرِ ربّ کہا گیا ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ عوامُ النّاس کو بہت کم ہی علم دیا گیا ہے، یعنی انھیں ربّ کی جانب سے براہِ راست ایسا قطعی علم یعنی الہام وحی نہیں ہوتا مگر اے نبی ﷺ یہ لوگ یہ بھی تو دیکھیں کہ ہم آپ ﷺ کو اس وحی کے ذریعے جو علم عطا کر رہے ہیں، اگر ہم آپ ﷺ سے بھی یہ علم روک لیں تو کوئی اور ہے جو آپ کو ہدایت دے سکے! مگر آپ ﷺ پر تو اللہ کا بے پایاں فضل ہے اور امرِ ہدایت آپ ﷺ ہی کے ذریعے ان بے علم لوگوں تک پہنچ رہا ہے۔۔۔ پھر ارشاد ہوا کہ اگر جنّ و انس جمع ہو جائیں تو بھی اس امرِ ربّ (اس امرِ ہدایت، قرآن، وحیِ الٰہی) کی مثل نہیں لا سکتے۔۔۔ اس طرح وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرّوح کے جواب

Marfat.com

میں یہ سارا بیان امرِ ہدایت ہی کی تفسیر ہے۔ (دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل آیت 85-88)

اب اس کے بعد لفظِ روح کی حامل صرف تین آیات بچتی ہیں اور ان میں سے دو آیات میں ارشاد ہوا: فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي (15:29 اور 38:72) ''پھر جب میں اس کی شخصیت کو مکمل کر لوں اور اس میں اپنا حکم جاری کر دوں''۔۔۔ اور ایک آیت میں فرمایا: ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ (32:9) ''پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی شخصیت کو مکمّل کیا اور اُس میں اُسی کا حکم جاری کر دیا''۔ اس آیتِ کریمہ میں تین جگہ ''ہ'' کی ضمیر آئی ہے اور عربی قاعدے، بالخصوص قرآنِ پاک کے اندازِ نگارش کی رُو سے انتشارِ ضمائر معیوب تصور کیا جاتا ہے یعنی ایک ہی سلسلۂ کلام میں یہ دُرست نہیں کہ ایک ہی ضمیر کو متفرق مراجع کی جانب راجع قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ یہاں بھی رُوحِہٖ میں ہ کی ضمیر سوّاہُ اور فیہِ کی طرح انسان ہی کی طرف راجع ہے جس کا معنی یہ ہوا کہ اُسی انسان سے متعلق حکم، وہی امرِ تکوین جو اُس خاص انسان کے لیے، اُسی کی شخصیت سے متعلق ہے، اُسی کا ڈی۔ این۔ اے بننے والا ہے اور مِن رُّوحی کا معنی یہی ہے کہ اللہ ہی کی جانب سے یہ امرِ تکوین نافذ ہو رہا ہے۔

اہلِ علم پوری دیانت داری سے اس بات کا جواب دیں کہ قرآنِ پاک کے ان 21 مقامات میں جہاں رُوح یا الرّوح کی اصطلاح آئی ہے، وہ مقام کہاں ہے جہاں سے باطنیّہ نے، فلاسفہ نے، متصوفین نے ''روح'' کا وہ تصور برآمد کر لیا ہے جو ان سب کے ہاں مروّج ہے۔۔۔ ہاں البتہ روح کا یہ تصور ویدانت میں ہے، افلاطونی فلسفے میں ہے اور نوفلاطونیت نے اسے وہ رنگ دے دیا ہے جو آفرینشِ کائنات کے فلسفیانہ اور متصوفانہ تصورات کی کلید ہے یعنی تنزلاتِ ستّہ کا عقیدہ جس سے فلوطینس یہودی نے عقلِ اوّل، حقیقتِ موسوی کا کھوج لگایا۔۔۔ نصرانیوں نے اسی عقلِ اوّل کو حقیقتِ عیسوی قرار دے دیا اور مسلمانوں کا روپ دھار کر باطنیّہ نے، المنافقون نے دعویٰ کر دیا کہ یہی تو وہ حقیقتِ محمد یہ ہے جو باعثِ تکوینِ کائنات ہے۔ اسی میں اللہ کی قدرتِ کاملہ کے انکار کا باطل عقیدہ شامل ہے۔ (ملاحظہ ہوں: فلاسفہ کی ہرزہ سرائیاں)

چنانچہ جب تک روح کے باطنی اور صابی عقیدے پر ضرب کاری نہیں لگائی جائے گی اور جب تک یہ اُصول طے نہ کیا جائے گا کہ ایک اصطلاحِ قرآنی کے ایک ہی بنیادی معنی ہوتے

Marfat.com

ہیں، تب تک شرک کی اس بنیاد، روح کے اس تصور کو باطل قرار نہیں دیا جاسکتا۔۔۔ وہی تصور جو روح کے غیر فانی، موتی (مُردوں) کے آس پاس موجود ہونے، اموات غیز احیاءٍ کے قرآنی فیصلے کی مخالفت کرتے ہوئے، مردہ اشخاص، انبیا و اولیا کی مزعومہ اصل، اُن کی روح کے زندہ ہونے، لوگوں کا کلام سننے، اُن سے استعانت ۔۔۔ جیسے اوہامِ باطلہ کا منبع ہے۔ ایسی باکمال روح، جو اِلٰہ غیر اللہ بن بیٹھی ہے، سب سے پہلے اُس کے وجود کا انکار کریں گے تب ہی برزخ اور قبر کی حقیقت اُمتِ مسلمہ پر آشکار ہوگی۔ اگر عقیدہ یہ ہو کہ روح یعنی مثالی جسم ہرگز نہیں مرتا تو کسی بھی دلیل سے اُس کی موجودگی کا انکار ممکن نہیں ہے۔ یہی فساد کی جڑ ہے۔

❁❁❁❁

اب ہم قرآنِ حکیم کی اُن آیات کی تفہیم کی جانب متوجہ ہوں گے جن آیات میں بعض مؤمنین یا بعض کُفّار کے، اُن کی موت کے فوری بعد کے احوال بتائے جانے کا احتمال ہے۔ ارشادِ باری ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (154:2)

اور نہ کہو مرے ہوئے ان کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم نہیں سمجھتے"۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ (169:3)

اور نہ خیال کرو ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے مردہ، بلکہ وہ تو زندہ ہیں۔ اپنے ربّ کے پاس رزق دیے جاتے ہیں"۔

مُحوّلہ بالا پہلی آیت میں مقتولین فی سبیل اللہ کی حیات بعدالموت کا شعور انسانوں کو نہ ہونے کا ذکر ہے۔ اِس سے یہ اشتباہ ہوسکتا تھا کہ یہ بات ہے اُن مقتولین کے محض رفعِ درجات کی ۔۔۔ مگر دوسری آیت میں انھیں رزق دیے جانے کی بات سے یہ اشتباہ رفع ہوگیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اُن شہدا کے زندہ سلامت ہونے کا مزید ثبوت اس طرح سے دے دیا گیا کہ یہ فوز وفلاح پانے والے، اُن انعامات پر جو انھیں اللہ کی جانب سے ملے ہیں، خوش وخرم اور شاداں وفرحاں ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مقتولین فی سبیل اللہ کی ساری کیفیات ایک مکمل زندگی کی ہی گنوائی

Marfat.com

ہیں جس میں رزق کا تذکرہ بھی ہے۔ گویا وہ انسانی جسد جیسے جسم کے حامل ہیں، دنیاوی زندگی کی طرح کھاپی رہے ہیں۔ ان کا جسد عنصری ہی ہے، اسے غیر عنصری ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ جنت اور جہنم میں ڈالے جانے والے سارے جسد عنصری ہوں گے۔

جس انداز میں مقتولین فی سبیل اللہ کے موت سے ہمکنار ہوتے ہی (از روئے قرآن) جنت کی فضاؤں میں داخل کیے جانے کا ذکر ہے اسی طرح ائمۂ کفر کو جہنم میں ڈال دینے کا تذکرہ بھی قرآنِ حکیم نے واضح انداز میں کر دیا ہے:

> فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (40:45-46)

> ''پس اللہ نے بچالیا اس (مردِ مومن) کو اس برائی سے جس کا وہ (آلِ فرعون) مکر کر رہے تھے اور آلِ فرعون کو برائی کے عذاب نے آلیا۔ یہی وہ آگ ہے جس کا سامنا وہ صبح وشام کر رہے ہیں۔ اور قیامِ قیامت کے روز (انھیں کہا جائے گا کہ) اے آلِ فرعون اب تم سخت ترین عذاب میں داخل ہو جاؤ''۔

اس بیان میں موت کے فوراً بعد اور قیامِ قیامت کے بعد، دونوں جگہ جہنم کا ذکر ہے۔ قیامِ قیامت کے بعد کا، جہنم میں تا ابد داخل کر دیے جانے کے بعد کا عذاب سخت ترین ہو گا۔۔۔فرمایا گیا کہ موت کے فوراً بعد انھیں صبح وشام عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔ عیاں ہے کہ صبح وشام کے الفاظ محاورۃً ہر وقت واقع ہونے والے امر کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ارشاد باری ہے:

> وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۔

تسبیح ربّ کا حکم عیاں ہے۔ محض صبح وشام کے اوقات کے لیے نہیں، اس کا صاف معنی یہ ہے کہ ہر دم تسبیح کرتے رہو۔۔۔یُعْرَضُون کے معنی محض پیش کرنا نہیں بلکہ جہنم رسید کرنا ہے جیسے کہ سورۃ الکہف آیت 100 میں ارشاد ہوا کہ پھر قیامِ قیامت کا صُور پھونکا جائے گا اور ہم سارے انسانوں کو جمع کریں گے:

Marfat.com

وَّعَرَضۡنَا جَهَنَّمَ يَوۡمَىِٕذٍ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ عَرۡضَا (100:18)

''اور ہم جہنّم کو کافروں پر پورے طور سے مسلّط کر دیں گے''۔

لغت کے اعتبار سے عَرَض کے معنی پیش کرنا کے علاوہ کسی شے کا رکھنا بھی ہیں (کسی برتن پر لکڑی رکھنا)۔۔۔(عَرَضَ علیٰ السَّیفِ: تلوار سے مارا، عَرَضَ علیٰ النَّار آگ سے جلایا) سورۃ الشّوریٰ آیت 45 میں آیا ہے کہ ایمان لانے والے، قیامِ قیامت کے بعد جنت کی فضاؤں میں رہتے ہوئے کہیں گے کہ اصل خسارہ تو یومِ قیامت کا خسارہ ہے اور ظالم یعنی کافر عذابِ جہنّم کو دیکھ کر کہیں گے کہ کیا اب واپسی کا کوئی راستہ باقی ہے!

وَتَرٰىهُمۡ يُعۡرَضُوۡنَ عَلَيۡهَا خٰشِعِيۡنَ مِنَ الذُّلِّ (45:42)

''اور تو دیکھے گا اُنھیں جہنّم رسید ہوتا ہوا، ذلّت اور عاجزی کی حالت میں''

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ''عَرَض'' کے الفاظ قیامِ قیامت کے بعد جہنّم میں مستقل داخلے کے معنوں میں آئے ہیں اور اِنہی معنوں میں ائمّہِ کفر کو بھی اُن کی موت کے فوراً بعد جہنّم مین داخل کر دینے کی معنی میں آرہے ہیں (عذاب کی شدّت کا فرق آیت 46:40 میں بتا دیا گیا ہے)۔۔۔ اس سے بھی واضح تر الفاظ سورۃ الاحقاف کے ہیں:

وَيَوۡمَ يُعۡرَضُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا عَلَى النَّارِ (20:46)

''اور جس دن کافروں کو جہنّم رسید کیا جائے گا''۔ (یہ روزِ حساب کا ذکر ہے۔)

چنانچہ ائمّہِ کفر کے موت کے فوراً بعد مبتلائے عذاب ہونے کے واقعہ کے ثبوت کے لیے نہ تو عذابِ قبر کا اِثبات ضروری ہے نہ ہی ''عذابِ برزخ'' کا مفروضہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔۔۔ درحقیقت یہ ''تصورِ روح'' ہی ہے جس کی موجودگی کے سبب علماءِ اسلام کو ایسے ''جہان'' اختراع اور آباد کرنا پڑے ہیں۔۔۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ جنت اور جہنّم کی ابدی زندگی کے لیے جن انسانوں کو جب چاہے گا دوسرا جسد عطا کر دے گا۔۔۔ جن ائمّہِ دین اور ائمّہِ کفر کو موت کے فوراً بعد دوبارہ زندہ کر دیا جائے گا، قرآنِ حکیم نے ہمیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ قیامِ قیامت (یعنی مکمل تباہی کے دن) کا صُور پھونکنے کا ان افراد پر کچھ اثر نہ ہوگا۔ یعنی نہ تو اُنھیں تیسری موت دی جائے گا (اور عیاں ہے کہ) نہ اُن کے لیے تیسری زندگی ہوگی۔ ارشادِ باری ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّوۡرِ فَصَعِقَ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِي الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ (68:39)

Marfat.com

''اور (ارض وسماء کی تباہی والے دن) یوم قیامت کے لیے صور پھونکا جائے گا، پس گر جائیں گے (غش کھا جائیں گے، موت پا جائیں گے) جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہوں گے۔ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ مگر وہ (ہلاک نہیں ہوں گے) جن کو اللہ چاہے گا (کہ وہ ہلاک نہ ہوں)''۔

قرآنِ حکیم میں مقتولین فی سبیل اللہ کے احوال پڑھ کر اکثر اہل علم نے یہ طے کر لیا کہ اب چوں کہ انبیا کا درجہ ''شہیدوں'' سے بڑا ہے اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ شہید تو جنت کے مزے لے رہے ہوں مگر انبیا قیامِ قیامت کے انتظار میں اپنی اپنی قبروں میں پڑے رہیں۔ (بطورِ لطیفہ عرض ہے کہ بعض لوگوں نے یہ حدیث بھی گھڑ لی ہے کہ انبیا اپنی قبروں میں نمازیں پڑھ رہے ہیں) بعض کم علموں نے اپنے اولیا اور اماموں میں سے ہر ایک کی ظاہر و بیّن طبعی موت کو زور وزبردستی قتل یعنی ''شہادت'' ثابت کرنا شروع کر دیا۔ اس جہالت کی وجہ قرآنی اصطلاح ''شاہد، شہادت اور شہید'' کی غلط تفہیم ہے۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (143:2)

''فرمایا کہ (تحویلِ قبلہ کا معاملہ اِبتلاء تھا اور اللہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی جانب اُس کی رہنمائی فرماتا ہے) اور اس طرح ہم نے تم کو (ملّتِ اسلامیہ کو، اُمتِ مسلمہ کو) سب سے اہم اُمت (سب سے زیادہ فضیلت والی اُمت) بنایا ہے تاکہ تم انسانوں پر (حق کا) اعلان کرنے والے بنو اور (یہ) رسول ﷺ (جو تمھارے درمیان ہیں) تم پر (اپنی زندگی میں، اپنے مخاطبین پر) اعلانِ (حق) کرنے والے ہیں''

ضمناً یہ وضاحت ضروری ہے کہ وسط، وُسطیٰ اور اوسط کے معنی اہم ترین کے ہیں جیسا کہ فرمایا: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى۔ سوچنا چاہیے کہ وہ کونسی چار نمازیں ہیں (پانچ روزانہ کی نمازوں میں سے) جن کی حفاظت کے ضمن میں انھیں کم اہم فرض کر لینے کی رخصت دی جا رہی ہے!۔۔۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ساری نمازوں (فرائض، مستحبّاب اور نوافل) کو ادا کرتے رہنے کی کوشش کرو اور بالخصوص ان میں سے ''اہم ترین'' نمازوں یعنی

Marfat.com

فرائض کو ہر حالت میں ادا کرو، ان سے غافل رہنے کی ہرگز رخصت نہیں۔ شہادت کے مضمون کو سورۃ الحج میں اس طرح واضح کر دیا گیا ہے:

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

(78:22)

"تا کہ رسول ﷺ آپ لوگوں کے سامنے اعلانِ حق کرتے رہیں اور تم (یعنی ان کے مخاطبین اور آئندہ آنے والے مسلمان) عامۃ النّاس کے سامنے شہادتِ حق کی ذمہ داری پوری کریں"۔

ملاحظہ فرمائیں سورۂ یٰسین میں ایک مردِ مومن کا واقعہ! تین رسولوں کی تکذیب کرنے والی ہٹ دھرم قوم سے ایک مردِ مومن نے خطاب کرتے ہوئے شہادتِ حق کی ذمہ داری ادا کی۔ ارشادِ باری ہے:

اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ○ قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ ○ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَ جَعَلَنِیْ مِنَ الْمُكْرَمِیْنَ (27-25:36)

"(اے میری قوم سن لو کہ) میں تم سب کے ربّ پر ایمان لے آیا ہوں۔ یہ بات بغور سن لو (میری پکار میرا اعلانِ حق سن لو)۔۔۔(پھر اس کے وفات پا جانے کے بعد) اُس سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اُس (مردِ مومن) نے یہ خواہش کی کہ کاش میری قوم کو معلوم ہو جائے کہ کس طرح اللہ نے مجھے (اپنی رحمت سے) ڈھانپ لیا ہے اور مجھے معزز لوگوں میں شامل کر لیا ہے"۔

اب چونکہ مفروضہ احوالِ قبر کی رُو سے مفسرینِ کرام کو اپنی مشکل حل کرتے ہوئے، شخصِ مذکور کو، بطورِ انعام، "عالمِ برزخ" میں داخل کرنا مقصود تھا۔۔۔ اس لیے اپنے طور پر طے کر لیا گیا کہ اُس مردِ مومن کو قتل کر دیا گیا تھا۔۔۔ گویا اگر وہ قتل نہ ہوتا تو "شہید" کا رتبہ نہ پاتا اور "عالمِ برزخ" میں جنت کے مزے نہ لُوٹتا۔۔۔ حالانکہ اِس مردِ مومن نے شہادتِ حق کی ذمہ داری ادا کی تھی اور یہی وہ اعزاز ہے جس کے باعث اِیمۂ دِین کو بھی موت کے فوراً بعد جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو مکھی، مچھر کی مثال دینے سے نہیں شرماتا، کیسے ممکن ہے کہ اُس

Marfat.com

مردِ مومن کے مقتول ہونے کا ذکر نہ فرماتا!!۔

❁❁❁❁

ائمہ دِین اور ائمہ کفر کو اُن کی موت کے فوراً بعد جنت و جہنم میں داخل کر دیے جانے کا جو نظریہ ہم نے سطورِ بالا میں پیش کیا ہے، یقیناً حرفِ آخر نہیں بلکہ مروجہ عذابِ قبر اور عذابِ برزخ کے احوال کی قرآنِ حکیم کے الفاظ کے ذریعے ابطال کی ایک کوشش ہے۔۔۔۔ تحقیقِ مزید کے لیے ہم نے علامہ (لیوپولڈ) محمد اسد کی انگریزی تفسیر کی جانب رجوع کیا۔ اُن کا نقطۂ نظر حیران کن ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیں اقرب الیٰ الحق بھی نظر آتا ہے۔ بہتر ہے کہ ان کی پیش کردہ وضاحت بھی بیان کر دی جائے کیونکہ ہمارا اصل نقطۂ نظر ان قبروں اور آستانوں، ان مراکز و منابعِ کفر کی تکذیب ہے اور اس کا بہترین حل یہی ہے کہ ہر طرح کے ''عذابِ قبر'' اور ''ارواحِ مبارکہ'' کی موجودگی کا بخوبی ابطال کر دیا جائے۔

یاد رہے کہ علامہ اسد ارضِ حجاز کی عربی، قرآن کی زبان سیکھنے کے لیے ایک عرصہ تک بدّوؤں کے ساتھ اُن کے خیموں میں، صحرا میں مقیم رہے۔ بہرحال علامہ فرماتے ہیں کہ:

قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ (36:26) اُس مردِ مومن کے اندر کی آواز ہے۔ اس کی بصیرت نے اُسے بتایا کہ وہ جنت کا حق دار ہونے والا ہے اور مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ کے الفاظ تمثیلی ہیں کہ یہ مردِ مومن اُن معدودے چند افراد میں سے تھا جو ہر دور میں شہادتِ حق کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں۔۔۔ علامہ اسد لکھتے ہیں: النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا (45:40) کا اصل معنی یہ ہے کہ وہ جہنم جس کا تذکرہ ہے، اُس کا وجود، اُس کی حقیقت کفار کو صبح و عشا یعنی مسلسل بتائی جاتی ہے، انبیا اور اُن کے اصحاب کی طرح ایسے ہی بہت سے مردِ مومن شہادت علی النّاس کی یہ ذمہ داری ہمیشہ پوری کرتے رہتے ہیں۔ (ترجمہ اور خلاصہ)

علامہ اسد کی رائے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ:

1 ہمیں محض اپنی ہی رائے پر اصرار نہیں۔ ہمارا اصرار اسی بات پر ہے کہ قرآن ہر طور حاکم ہے۔
2 ہم نے جو کچھ لکھا بفضلِ اللہ اور قرآن سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے لکھا اور ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس کج مج بیانی پر فخر کا اظہار کریں۔
3 ہمیں ہر اُس رائے سے اتفاق ہے جو منابع و مصادرِ شرک کی تکذیب کرتا ہو۔

Marfat.com

4 ہم علامہ ابوالخیر اسدی کی ان مساعی کے معترف ہیں جو آپ نے افلاطونی تصورات کو باطل ثابت کرنے کے لیے کیں۔ اعیانِ ثابتہ اور حقیقتِ محمدّیہ کے نظریات درست نہیں۔

5 ہم ڈاکٹر عثمانی کی راست فکری کے قائل ہیں۔ تعبیر کی غلطیاں درست کی جاسکتی ہیں۔

6 ہم چاہتے ہیں کہ اصطلاحاتِ قرآنی کی درست تفہیم کی مساعی کو آگے بڑھائیں۔

7 ہمیں یہی مطلوب ہے کہ سماع وحیاتِ موتی کے ہر باطل تصور کا ردّ کرتے رہیں۔

8 ہم اس بات کے قائل ہیں کہ ہر قرآنی آیت کا ایک ہی درست معنی ہے اور ہم نے اسے دریافت کرنا ہے یہ نہیں کہ جہاں چاہیں نفس کا معنی روح کر کے آیت کے معانی بدل دیں۔

9 ہر آیت کے ایک ہی درست معنی تک اس وقت تک رسائی ناممکن ہے جب تک ہم ہر قرآنی اصطلاح کا ایک ہی درست معنی متعین نہ کرلیں۔

0 ہمیں باطنیہ کے پھیلائے ہوئے مکر سے ہر صورت نجات حاصل کرنا ہے۔

علامہ ابوالخیر اسدی رحمۃ اللہ علیہ اور ڈاکٹر مسعود الدّین عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی راست فکری اپنی جگہ، پچھلے چودہ سو برس میں عجمی افکار نے جس طرح کا زنگ دینی فکر پر چڑھا دیا ہے، اس دَجل وفریب سے دامن بچانے کے لیے اللہ کا خاص فضل اور اللہ کی خصوصی مدد درکار ہے۔ غلط افکار سے برأت کے لیے بہت بڑی جرأت اور بڑا جذبہ اللہ کی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ مؤمنین صالحین کی معیّت میں ہم بھی دست بدعا ہیں: اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا۔

❁❁❁❁

اب کچھ تذکرہ اُن روایات کا جنھیں بطور حدیثِ رسول ﷺ کے ڈاکٹر عثمانی نے بھی اپنے رسالے عذابِ برزخ میں پیش کیا ہے:

1 بخاری شریف کی روایت، روایہ حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا: روایت میں ذکر ہے عمرو بن لحی الخزاعی کا کہ نبی ﷺ نے اسے جہنّم میں دیکھا۔ نبی ﷺ کی یہ رویت گمان غالب ہے کہ رویاءِ صادقہ یعنی حالتِ خواب کی رویت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس رُویا کے ذریعے ایامِ جاہلیّہ کی بتوں کے نام پر جانور چھوڑنے کی رسم کی قباحت اور اس پر ہونے والے عذاب کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس سے یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ واقعتاً کہیں جہنّم میں ایسا ہورہا ہے۔۔۔ یہ ایک علامتی خواب بھی ہوسکتا ہے۔ ایسا ہونا برزخ میں بھی ثابت نہیں ہوتا تاہم اگر یہ تسلیم کرلیا

Marfat.com

جائے کہ عَمر و مذکور کو جہنم کی طرح کا عذاب دیا جا رہا ہے تو ہم بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ ہاں ایسا ہی ہے اور عَمرو بھی اُن ائمہ کفر میں سے تھا جنھیں (فرعون اور اس کے حواریوں کی طرح) مرتے ہی اللہ تبارک وتعالیٰ جہنم واصل کر دیتا ہے۔ چنانچہ عذابِ برزخ اس سے ثابت نہیں ہے۔

2 بخاری کی ایک اور روایت صراحتاً نبیِ اکرم ﷺ کا ایک خواب ہے اور یہ تمثیلاً بعض کبیرہ گناہوں پر عذابِ الٰہی کے ضمن میں ہے۔۔۔۔ اِن احوال کو بھی جہنم کے ہی واقعی اور قطعی حالات مان لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان تمام واقعات کے ذیل میں کہیں بھی اِن اُمور کے عذابِ قبر ہونے یا عذابِ برزخ ہونے کا کوئی مذکور نہیں۔ بلکہ بہتر یہی ہے کہ انھیں خواب سمجھا جائے۔

3/4 بخاری کی ایک اور حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مقتول فی سبیل اللہ کے جنت میں ہونے کا ذکر ہے اور عیاں ہے کہ یہ بات قرآنی دعویٰ ہی کی ایک مخصوص شہید کے بارے میں تائید ہے۔ نہ اس میں قبر کا ذکر ہے، نہ ہی برزخ کا۔ ایک اور حدیث میں جنت الفردوس کا عرشِ الٰہی کے نیچے ہونے کا ذکر بھی حیاتِ برزخ کی تائید بہرحال نہیں ہے۔

5 بخاری کی ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا انھیں اُن کا مقام جنت میں دکھایا گیا اور وہ الیٰ الرفیق الاعلیٰ کہتے ہوئے رخصت ہوئے یعنی وہ یہاں اپنی قبر میں نہیں جنت میں اپنے ربّ کے ہاں پہنچ گئے۔ بات درست ہے اور مان لینا چاہیے کہ ایسا ہی ہے۔

6 نبی ﷺ کے صاحبزادے ابراہیم کے بارے میں یہ روایت کہ وہ جنت میں کسی عورت کا دودھ پی رہے ہیں۔۔ اس روایت سے بھی حیاتِ برزخ ثابت نہیں ہوتی اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جو بھی نیکی اور بدی کرنے پر گناہ وثواب کا مکلف نہیں، اس کا جنت یا دوزخ میں جانا از روئے قرآن ثابت نہیں ہوتا۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت کسی کذاب نے گھڑی ہے۔ (ہر جان دار حتیٰ کہ دابہّ کے بھی اللہ کی طرف یُحشَرُون۔۔۔۔ ہانکے اور اکٹھے کیے جانے سے ثابت ہوا کہ اُن سب کا حشر ہوگا مگر جنت وجہنم کا فیصلہ تو اعمال کی جواب دہی سے وابستہ ہے)۔

7 صُور پھونکنے کے بارے میں بخاری کی ایک روایت ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ ہیں۔ اس روایت میں جتنی باتیں کہی گئی ہیں، سب غلط ہیں اور ان کی نسبت نبی ﷺ کے فرمان سے کرنا بھی غلط ہے۔ تاہم اس حدیث سے حیاتِ برزخ کا کوئی تعلق، واسطہ نہیں ہے (اوّلاً صُور کی دو پھونکوں کے درمیان کا وقفہ درست طور پر بتایا ہی نہیں گیا، گویا راوی کو یا روایت

Marfat.com

بنانے والے کو خود اندازہ نہیں کہ درست وقفہ کیا ہوگا۔ ثانیاً بارش برسنے سے لوگوں کا، مُردوں کا نباتات کی طرح اُگنا تو دراصل واللہ انبتکم من الارض نباتاً سے ماخوذ ہے مگر یہ اوّلین پیدائش یعنی آدم وحوا کی تخلیق کے بارے میں ہے جنھیں سلالۃٍ من طین سے، ایک جرثومے سے پیدا کیا گیا۔ ثالثاً عجبُ الذِّنَب والی غلطُ العام بات بھی درست نہیں ہے۔ یہ تو انسان کا DNA (ڈی۔این۔اے) ہے جو مرتا نہیں اور شاید اُسی سے دوبارہ انسان بنایا جائے گا۔ (اگرچہ قدرتِ کاملہ اس کی بھی محتاج نہیں ہوگی)۔

8 بخاری کی جس روایت پر ڈاکٹر عثمانی صاحب نے زیادہ بحث کی ہے، اس روایت میں مذکور ہے کہ قبر کا مردہ اپنے ساتھیوں کے جوتوں کی آواز سنتا ہے یہاں تک کہ اُس کے پاس دو فرشتے آکر اس کا امتحان تین سوالوں میں کرتے ہیں۔۔۔ اس روایت کے الفاظ کی صرفی ونحوی بحث بھی فضول ہے اور اس کی متعدد تفاسیر بھی محض من گھڑت ہیں۔ جس قدر بھی اس روایت کے الفاظ کے ساتھ کھینچا تانی کر لیں، اس میں سے ''برزخ'' کسی صورت برآمد نہیں ہوتا۔۔۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اوّل: مرنے والا سن ہی نہیں سکتا۔ دوم: قبر دارُ الامتحان نہیں ہے۔ منکر نکیر کی جانب سے امتحان کی بات ہی غلط ہے۔ سوم: ائمۂ کفر اور ائمۂ دین کو مرنے کے بعد فی الفور جہنم اور جنت میں ڈالنے کے لیے اللہ تعالیٰ ملائکہ کے ذریعے اُن کے امتحان کا حاجت مند نہیں ہے اور چہارم: جوتوں کی آواز کو ملائکہ کے جوتوں کی آواز ثابت کرنا، کارِ عبث ہے۔ روایت ہی غلط ہے، اس کے اجزاء سے بحث کیا کرنا!

9/0 قلیبِ بدر کے واقعے میں مُردوں کے سننے کی بات کا تذکرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے ہوا تو آپ نے راوی کو یہ کہہ کر جھڑک دیا کہ قرآن نے فیصلہ دے دیا ہے کہ ''مُردے نہیں سنتے''۔ مطلب یہ کہ یا تو راوی جھوٹا ہے یا اُس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو ٹھیک سے سنا نہیں یا سمجھا نہیں۔

یہودی عورت یا مَرد کے مُردے پر اُس کے اقربا کا رونا اور اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کہنا کہ یہودی مُردے کو عذاب دیا جا رہا ہے، اس میں کوئی عجوبہ نہیں۔ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنھیں اس مُردے کا یہودی ہونا معلوم تھا اور وہ جانتے تھے کہ یہودی بالفعل مشرک ہیں، نبی پر ایمان بھی نہیں لائے، اس یہودی کے بطورِ انذار عذاب پانے کی بات نہیں کر سکتے تھے!! ایسی کئی اور مثالیں بھی ہیں۔

علاوہ بریں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اگر یہ روایت واقعی حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے تو ہم جانتے ہیں

Marfat.com

کہ نبی ﷺ اَفصحُ العرب تھے، الفاظ کے انتخاب میں اعلیٰ پایے کے ادیبوں سے بھی ارفع و اعلیٰ صلاحیت کے مالک تھے۔ جب آپ ﷺ نے قبر کہا تھا تو وہ قبر ہی ہے، برزخ ہرگز نہیں ہے۔

@/! دو قبروں پر ٹہنیاں لگانے کی روایات پر بحث کے دوران میں عثمانی صاحب لکھتے ہیں: ''اللہ کا فیصلہ ہے کہ قیامت سے پہلے مُردہ جسم میں روح واپس نہیں آسکتی''۔۔اب اگر آپ کے کہنے کے مطابق عذاب قبر میں نہیں برزخ میں دیا جاتا ہے تو کیا مُردے کو ''روح'' کے بغیر ہی عذاب کا احساس ہوسکتا ہے!۔۔۔اصل بات تو یہ ہے کہ ''روح'' کو لافانی مان لیا گیا ہے، پھر اب اس روح کو کوئی بدن ضرور ''الاٹ'' ہونا چاہیے۔ خواہ وہ قبر والا بدن ہو یا برزخ والا۔۔۔دونوں باتیں ہی غلط ہیں۔

$/# مسلم کی حدیث میں ذکر ہے کہ مشرکوں کی قبروں کے پاس آپ کا خچر بدک گیا۔ غنیمت ہے کہ ڈاکٹر عثمانی نے خود ہی اس روایت کو وضعی قرار دے دیا ہے۔ اور روایت گھڑنے والوں کو کم از کم یہ بات تو ملحوظ رکھنی چاہیے تھی کہ اِطّلاع علیٰ الغیب نبی ﷺ کو ہونی چاہیے نہ کہ کسی خچر کو!۔۔۔اسی طرح پتھر کے گرنے کی آواز میں جہنّم کا تذکرہ ہوا ہے نہ کہ ''عالَمِ برزخ'' کا۔

^/%/ عَمرو بن العاص نے جب وہ سکراتِ موت میں تھے کہا کہ انھیں دفنانے کے بعد کچھ دیر وہاں رکیں تاکہ مُردہ عَمرو اُن کی موجودگی سے حوصلہ پکڑیں۔ اوّلاً: یہ اثرِ صحابہ میں سے ہے، حدیث ہے ہی نہیں۔ ثانیاً: عَمرو کی ذاتی رائے اُن کی کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہوسکتی ہے۔ ثالثاً: اس روایت کی تصدیق میں عثمانی صاحب کا یہ کہنا کہ: ''سکرات کے دوران میں عَمرو کا ایسی غلط بات کہنا، (نعوذ باللہ) سکرات کے وقت نبی ﷺ کی بات کے مشابہ ہے''۔۔۔حدیثِ قرطاس کو سچ جاننا غلط ہی نہیں نبی ﷺ کی ذاتِ اقدس کی توہین بھی ہے۔ یہ روایت المنافقون کی اختراع ہے جو یہ ثابت کر پائے ہیں کہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ گستاخِ رسول ﷺ تھے، صحابہ عمر رضی اللہ عنہ کی ہیبت سے لرزاں تھے، صحابہ رسول اللہ کے ساتھ مخلص نہیں تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ وہ واحد مخلص مومن تھے جو نبی ﷺ کی پکار سن کر کاغذ قلم لانے کو دوڑے، دیگر صحابہ نعوذ باللہ پہلے ہی منافق تھے، سکرات کی حالت دیکھ کر مُرتد ہو گئے، صحابہ کو یہ علم ہی نہیں تھا کہ نبی ﷺ کی پکار کسی عام انسان کی پکار نہیں۔ جیسا کہ بخاری میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کو دو برتن دیے گئے تھے۔ (جھوٹی حدیث ہے۔ نبی ﷺ نے ابلاغ کا حق پوری طرح ادا کیا ہے) سکرات

Marfat.com

کے عالم میں دوسرا برتن نبی ﷺ کھولنے لگے تھے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے منع کر دیا اور علی رضی اللہ عنہ نے اطاعت کا رویہ اختیار کیا اس لیے انھیں باطنی طور پر یہ ''علم لدنّی'' حاصل ہو گیا۔ نبی ﷺ نے اپنا یہ فرض کہ انھیں رسالت کا حق ادا کرنا ہے، ادا نہیں کیا، عمر رضی اللہ عنہ کے گستاخانہ رویّے کے باعث اُمت اہم ترین پیغام سے محروم رہ گئی۔۔۔

ڈاکٹر عثمانی نے صلحِ حدیبیہ کے موقع پر معاہدہ کی شقوں میں اصلاح کے معاملہ کو نبی ﷺ کی جانب سے حالتِ سکرات میں کی گئی بات کو ردّ کر دینے سے مشابہ قرار دے دیا۔ ڈاکٹر عثمانی رحمہ اللہ کو یہ زیب نہیں دیتا۔ ان دونوں واقعات میں باہم دِگر کوئی مناسبت نہیں اور درحقیقت ایسا کوئی واقعہ ''حدیثِ قرطاس'' والا، ہوا ہی نہیں۔ یہ سب ''علم لدنّی'' کے دعویٰ داروں اور صحابہ کو مرتد قرار دینے والوں کی لاف زنی ہے۔۔۔ عَمرو بن العاص والی روایت کے ضمن میں بالکل درست بات ڈاکٹر عثمانی نے لکھ دی ہے اور وہی حتمی اور یقینی ہے: ''اس بات میں پورے قرآن کی نفی ہے۔ قرآن کے لحاظ سے دفن کیے جانے والے مُردے میں نہ تو زندگی ہوتی ہے نہ احساس''۔ اس طرح قبر میں منکر نکیر کا سوال و جواب کا معاملہ نبی ﷺ کی حدیث ہونا ثابت ہی نہیں ہوسکتا۔

& مسلم سے ڈاکٹر عثمانی نے ''حدیثِ معراج'' کے احوال نقل کیے ہیں۔ خود فرماتے ہیں اور دُرست اعتراض ہے کہ اگر نبی ﷺ نے انبیا سے زمین پر، اُن کی قبروں میں یا باہر ملاقات کی ہوتی تو دورانِ معراج میں ہر نبی سے ملاقات کے موقع پر یہ کیوں پوچھتے: مَنْ هٰذا یا جبریل!۔۔۔ آپ کا یہ کہنا بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ معراج کی رات پوری کی پوری معجزہ کی رات ہے۔۔۔ بلکہ ہم اس سے بڑھ کر کچھ اور کہنے کی جسارت کریں گے۔ ایک ہی سفر کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے شبِ اِسریٰ کہتا ہے، مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک سفر جبکہ روایت کہتی ہے کہ نہیں یہ سفر محض اتنا نہیں یعنی لاہور سے گوجرانوالہ تک والی قرآنی بات غلط ہے، نامکمل ہے، جانے والا تو پشاور سے ہو کر آیا ہے۔۔۔ اب بتائیے کہ قرآن غلط ہے یا راوی!۔۔۔ مزید براں روایتِ اسریٰ کے اختتام پر راوی کا یہ دعویٰ کہ مشرکین کے سوالوں کا جواب بآسانی دے پانے کے لیے نبی ﷺ کے سامنے مسجدِ اقصیٰ لے آئی گئی جب کہ اصل تاریخی حقیقت یہ ہے کہ ارضِ فلسطین میں، اُس زمانے میں مسجدِ اقصیٰ کا کہیں کوئی وجود نہ تھا۔۔۔

Marfat.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی حضرتِ یعقوب علیہ السلام کی اصل قربان گاہ کے مقام پر ایک معمولی کلیسا نما عمارت ہی دکھائی گئی تھی۔۔۔ سفرِ اسریٰ کا دعویٰ قرآنی ہے، حق ہے، سچ ہے۔ اُس کی کیفیت اور نوعیّت کا ہمیں دُرست علم نہیں۔ سفرِ معراج کا دعویٰ انسانی ہے، ظنّی ہے، بے شمار شکوک و شبہات کو جنم دینے والا ہے۔ اسی روایت میں بہت سا اِدخال یہود کی جانب سے ہے جو یہ ثابت کر پائے ہیں کہ تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو (نعوذ باللہ) محض بھولے تھے، پچاس نمازوں کا تحفہ ملنے پر خوش خوش رخصت ہو رہے تھے۔ یہ تو ہمارے ذہین وفطین نبی (موسیٰ علیہ السلام) تھے جنھوں نے رہنمائی کی اور اُمت کو اتنی بڑی مشقّت سے بچا لیا۔

* مسلم کی ایک اور روایت کے حوالے سے ڈاکٹر مسعود الدّین عثمانی رحمہ اللہ نے حق کہنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عِلّیّین اور سِجّین کو کِتابٌ مرقوم کہا ہے چنانچہ اُنھیں مقامات کہہ کر ارواح کا ٹھکانہ قرار دینا یقیناً کِذب و افتراء ہے اور ڈاکٹر عثمانی نے بالکل درست رہنمائی کر دی ہے۔ اسی بحث میں ڈاکٹر عثمانی کا یہ فرمانا بھی حق ہے کہ: ''قیامت سے پہلے مُردے زندہ نہیں کیے جائیں گے'' اور یہ بھی درست فرمایا کہ شبیہہ اور کشف کی کوئی اصل نہیں''۔۔۔ چنانچہ یہ مان لینا چاہیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض قبروں کو ظلمات سے بھرپور کہنا محض تمثیلی معاملہ ہے، اُسے بات کا محل بدل کر برزخ کے احوال قرار دیے جانے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ درحقیقت ایسا ہوتا ہے اس لیے کہ اکثریت کو بعث عند یوم الحساب سے پہلے دوسری زندگی نہیں ملے گی۔۔۔ ڈاکٹر عثمانی نے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی قبر میں مردہ کے زندہ ہو کر سوالوں کا جواب دینے کی بات کو ردّ کر دیا ہے۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ بات بھی درست ہے کہ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ (40:7) سے مراد یہی ہے کہ: ''آیات کی تکذیب کرنے والوں کی پذیرائی نہ ہوگی''۔ (یہی بات حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر سے بھی عیاں ہے۔)

) ترمذی کی روایت (راوی ابنِ سعید) کو ڈاکٹر عثمانی نے ابتداً ہی موضوع قرار دے دیا ہے۔ راویوں میں عطیہ اور کلبی کذاب ہیں۔۔۔ چنانچہ قبر میں عذاب پانے کی تمام باتیں جھوٹ ہیں۔۔۔ ترمذی کا خود ہی اس روایت کے ''غریب'' ہونے کا اعتراف اس امر کا ثبوت ہے کہ ترمذی جیسے غیر محتاط محدثین نے روایتِ حدیث کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ اس روایت کی تمام جھوٹی خبریں آج ہمارے مفسرین اور خطیبوں کا ''اصل'' سرمایہ ہیں۔ اس کِذب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم

Marfat.com

سے منسوب کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔

❁❁❁❁

کتاب عذابِ برزخ کے آخر میں ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض مشاہیر علماء مسالک کے فتاویٰ نقل کر دیے ہیں جن کی نوعیت ہماری نظر میں ہفوات (لغزشوں) سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے۔۔۔ تاہم ہماری عثمانی صاحب کے متوسّلین اور دیگر مؤمنینِ صالحین کی خدمت میں گذارش یہ ہے کہ ان تمام غلط العام عقائد کے معاملے میں خرابی کی اصل وجہ کسی ''روح'' کی موجودگی کا اعتراف ہے جو محض کِذب و افتراء ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے غلط العام آرا پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: مولانا مودودی نے قرآن، حدیث اور اجماعِ صحابہ کے اس عظیم الشان مسئلہ کو فروعی مسئلہ بنا دیا۔۔۔ اور مولانا مودودی نے کہا۔۔۔ ''اگر کوئی شخص ولی اللہ کی قبر پر پہنچ کر زور زور سے پکار کر اُن سے دُعا کی درخواست کرے تو عقیدہ کی خرابی لازم نہ آئے گی''۔۔۔ ملاحظہ کریں کہ مودودی صاحب نے اپنے محوّلہ بالا دونوں فتاویٰ میں جو موقف اختیار کیا ہے، اُس کی بنیاد میں ''روح'' کا تصورِ عمومی کارفرما ہے۔ فرماتے ہیں: ''ہوسکتا ہے اُن کی روح تشریف فرما ہو''۔۔۔ ان کے علاوہ امام احمد بن حنبل کی کتاب الصّلواۃ میں، امام ابن تیمیہ حنبلی کی الفتاویٰ الکبریٰ میں اور امام ابن قیّم حنبلی کی کتاب الرّوح میں بھی ساری باطل واردات انھی ''ارواح'' ہی کی بدولت ہے۔

میاں نذیر دہلوی، پیر جھنڈا بدیعُ الدّین راشدی اور دیگر علما بھی ''ارواح'' کی موجودگی کی وجہ سے ''عذابِ قبر'' کے اثبات میں اور انبیا و اولیا کی حیاتِ قبر کے اثبات میں سارا زور صرف کرتے رہے ہیں۔ اور تو اور وہابیّین کے امام محمد بن عبدالوہاب نجدی کے صاحبزادے عبداللہ بھی رقم طراز ہیں کہ: ''آپ ﷺ اپنی قبر مبارک میں حیاتِ دائمی سے متصف ہیں''۔۔۔ حالانکہ از روئے قرآن انبیا، صدیقین اور شہدا یعنی (شہادتِ حق کی ذمّہ داری ادا کرنے والے) جنت میں ہیں، نہ کہ قبر میں یا مزعومہ عالمِ برزخ میں!

قارئین کرام! بڑی ہی سیدھی اور صاف بات ہے۔ اگر فلاسفہ اور صوفیہ کے پاس ایک بھی صحیح حدیث ہوتی جس میں روح کو کہیں ڈالنے اور نکالنے کا ذکر ہوتا تو انھیں (اور کسی اور کو بھی) کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ عربِی مبین میں نازل ہونے والے قرآن کے صریح الفاظ کے معانی

Marfat.com

دانستہ بدلنے کی کوشش کرے۔ اللّٰہُ یتوفیَّ الْاَنْفُس۔۔۔ میں نفس کی بجائے روح کا معنی فرض کر لیا گیا اور اس سے روح کے نکلنے اور واپس جسد میں (گویا زبردستی) داخل کر دیے جانے جیسے (جس کی کوئی صورت عربی الفاظ سے نہیں نکلتی) ایسے ہی کئی عقائد مستنبط کر لیے گئے جو کشف وکرامات اور تصوف کا بنیادی سرمایہ ہیں۔ اسی طرح اَخْرِجوا انفسَکُم میں روح کہاں سے آ گئی! اور وَاِذَا النفوسُ زُوِّجَت کا بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ ''زوج'' قرآن میں ہر جگہ ایک ہی جنس کے جوڑے کے لیے آیا ہے۔ یعنی کہا یہ جا رہا ہے کہ نفس سے نفس کا جوڑا بنایا جائے گا، روح کا کہیں مذکور نہیں۔۔۔ اسی طرح وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ (جسے ہمارے عالی قدر مفسرین آیہ عہد الست کا نام دیتے ہیں) اس آیت میں ذکر ہو رہا ہے بنی آدم کا، نفوسِ انسانی کا اور شہادت (یعنی اعلان) کا مگر سبحان اللہ! یہ ہمارے بزرگانِ دین اس آیت میں بھی کہیں سے خود آدم علیہ السلام کو، ارواحِ انسانی کو اور ''عہد'' کو ڈھونڈ کر لے آئے! چنانچہ یہ سارا پاکھنڈ جو الفاظ واصطلاحاتِ قرآنی سے کھیلا جا رہا ہے، اس کی بابت یہ کھوج لگانا ضروری ہے کہ یہ کھیل کھیلنے والے اوّلین نام نہاد مفسرینِ قرآن کون تھے!! بالیقین یہ کارنامہ مقاتل بن سلیمان یمنی ایرانی اور امام راغب اصفہانی ایرانی کا ہے۔ پس خبردار رہو۔ فَاعتبروا یا اُولِی الابصار!!

راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے: النَّفْسُ اَلرُّوحُ فی قولِہٖ اَخْرِجُوا اَنفُسَکُم۔ گویا اللہ تعالیٰ لکھنا تو چاہتا تھا اَخْرِجُوا اَرْوَاحکُم مگر نہ جانے کس مجبوری کے تحت (نعوذ باللہ) روح کی بجائے نفس لکھ دیا۔ راغب اصفہانی (المتوفّٰی 486ء) سے پہلے مقاتل بن سلیمان (المتوفّٰی 150ھ) نے اَنفُس کی ایک ''وجہ'' یوں لکھی ہے: اَلْاَنفُس یعنی روحُ الانسان اور مثال دیتے ہوئے اَخْرِجُوا نفُسکُم اور اللہ یَتَوَفَّی الْاَنفُس، انھی دونوں آیات کا حوالہ دیا ہے۔ مزعومہ رُوح کے ہونے کی مفسرین کو کوئی دلیل نہ ملی تو یہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگ گئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ صریحاً کہا، حقیقت وہ نہیں بلکہ اس لفظ کے وہ ''باطنی'' معنی ہی اس کے اصل معنی ہیں جو ہم نے دریافت کیے ہیں۔ اسی روح کی موجودگی سے عالم برزخ کا وجود ثابت کیا جاتا ہے۔ بقولِ خود مشاہیر علما اسلام سے استفادے کے بعد عبدالکریم اثری اپنی مشہور تفسیر عُروَۃُ الوثقیٰ میں لکھتے ہیں: (دیکھیے: تفسیر آیت 100، سورۃ المومنون): ''برزخ میں دو مقامات کا ہونا بیان کیا جاتا ہے اور دو مقامات کے نام علیین اور سجّین رکھے گئے ہیں۔

Marfat.com

''(بیان کرنے والا ابلیس ہی ہوسکتا ہے کیونکہ قرآن کی اپنی وضاحت کے مطابق تو یہ دونوں مقامات نہیں بلکہ کتابٌ مرقوم ہیں، لکھی ہوئی کتابیں!) اور لکھتے ہیں: قبر سے مراد وہ مقام ہے جہاں مرنے کے بعد جسم خاکی نے جگہ حاصل کرلی ہو، یا یوں کہہ لو کہ جہاں مرنے کے بعد روح جسم میں موجود رہے''۔

جب روح کی موجودگی ''ثابت'' ہوگئی، اُس کی شان بڑھ گئی، اسے اُڑنا نصیب ہوگیا تو اب پیر باگڑ شاہ کی رُوحِ پُرفتوح سے استعانت اور استمداد کا راستہ بھی کُھل گیا۔ اسی لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ توحید کے چشمۂ صافی کو شرک کی آلائشوں سے صاف کرنا ہے تو ''روح'' کے ''لافانی لاشے'' کو نکال باہر کرنا ہوگا۔

یہ سبھی کچھ اس قدر واشگاف الفاظ میں عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب برزخ میں مکانیت تسلیم کرلی تو پھر اس عالم برزخ کے قبور اور مزارات تک پھیلنے کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ عامۃُ النّاس اسے قبر کی زندگی کہہ رہے ہیں اور معدودے چند اصحاب اسے برزخ کی زندگی سے تعبیر کررہے ہیں۔ برزخ میں مکانیت کا نہ ہونا آیاتِ قرآنی سے ثابت ہے جب کہ قبر میں روح کا موجود ہونا، کسی بھی رنگ میں کیوں نہ ہو، تب تک نہیں جھٹلایا جاسکتا جب تک روح کے افلاطونی تصور سے نجات حاصل نہ کرلی جائے۔۔۔ مرنے والوں کی ارواح کی موجودگی، اُن کی آمدورفت، اُن کی جانب سے ملاقات اور پیغام رسانی ثابت کرنے کے لیے خواب جیسے احوال کا سہارا لیا جاتا ہے۔ تفصیلات ملاحظہ ہوں۔

علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغوی نے نقل کیا ہے کہ نیند میں روح نکل جاتی ہے مگر اس کا مخصوص تعلق بدن سے بذریعہ شعاع کے رہتا ہے جس سے حیات باطل نہیں ہونے پاتی۔ (نقل فرماتے ہوئے یہ نہ سوچا کہ بغوی کا بیان روایت کے اُصولوں پر بھی اپنی صحت کے لحاظ سے پورا نہیں اترتا اور روح کا بدن سے خارج ہوجانا مگر شعاع کا سا تعلق محض خیال آرائی ہے۔ ایسے گمانِ باطل کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب کرنا سخت زیادتی ہے۔)

جناب امیر افضل خان فرماتے ہیں:

''نیند کے دوران انسانی ہستی (نفس) اس مادّی جسم سے الگ ہوکر بدستور قائم رہتی ہے اور وہ کسی خوابی وجود کے ساتھ عالم بالا اور عالم دنیا کی سیر کرتی ہے۔

Marfat.com

یہ حقیقت ہے کہ خواب میں بھی نفسِ انسانی، جسدِ خاکی کو چار پائی پر چھوڑ کر کسی اور جسم یا وجود کے ساتھ زمان و مکان میں غوطے لگاتا رہتا ہے''۔

''اس لیے قبر بھی کوئی پکّی شے نہیں بلکہ برزخی زندگی کے لیے ایک اشارہ یا استعارہ ہے یا ہمارے مادّی وجود کو پردے میں رکھے ہوئے ہے''

''(نفس) نئے وجود کے ساتھ پہلے برزخ میں قیام کرتا ہے اور پھر حشر کی طرف جاتا ہے''

''فوت شدہ انسانوں نے اپنی قبر کی توقیر کے بارے میں اپنے رشتہ داروں کو خواب میں آگاہ کیا''۔

''مادّی بدن کی طرح نفس کوئی ظاہری چیز نہیں اور یہ روح کی طرح ایک باطنی حقیقت ہے''۔

''انسانی نفوس اپنے اجداد کی پشت میں سفر کرتے رہتے ہیں''۔

''نفس ایک طاقت اور Energy ہے، موت اُس کی ہلاکت نہیں، نقل مکانی ہے اور روح امرِ ربّی ہے، اللہ کی طرف لوٹ جاتی ہے''۔

اکثر مفسرین نے اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ کی تفسیر میں نفس کو روح لکھا ہے یا جان۔ میجر صاحب قبلہ نے احتیاط برتی اور نفس کی اصطلاح کو برقرار رکھا۔ آپ وحدۃُ الوجودی صوفی ہیں اور آپ کی تفسیر بصائر الفرقان ابنِ عربی سے مُستفاد ہے۔ چنانچہ آپ کے اس طرزِ عمل نے کہ نفس کا معنی نفس ہی ہے، راقم الحروف کو ایک خوش فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ راقم نے 1999ء میں اپنی کتاب قرآنِ حکیم اور انسان میں ان دو اُمور پر شدّ و مدّ سے بحث کی تھی کہ قرآنی اصطلاح کا ترجمہ کرتے ہوئے درست مترادف ڈھونڈنا چاہیے اور یہ کہ روح تو بس امرِ ربّ ہے، علیحدہ وجود نہیں رکھتی۔ یہ کتاب میجر امیر افضل خان کو پیش کی تھی۔ آپ نے پڑھی اور مختصر تبصرہ بھی کیا۔ میجر امیر افضل نے ان دونوں مذکورہ احتیاطوں کو ملحوظِ خاطر رکھا۔ مگر جو اُمور روح کے ساتھ صدیوں پہلے وابستہ کر دیے گئے تھے وہی کچھ نفس کو ''لطیف بدن'' قرار دے کر تفویض کر دیے گئے ہیں۔۔۔۔اور برزخ کے لیے مکانیت بھی وہی تلاش کر لی گئی ہے جو غلط العام ہے۔

خواب کے اُمور بھی میجر صاحب کے ہاں وہی مذکور ہوئے جو ہم پہلے بیان کر چکے کہ محض

Marfat.com

ظنّی ہیں اور آپ نے خواب کے احوال کو ملاقات ہی قرار دیا ہے۔ ہم ازیں قبل یہ بتا چکے ہیں کہ خواب گہری نیند میں نہیں آتے (یعنی جب صوفیہ کے کہنے کے مطابق روح یا نفس بدن سے خارج ہو چکا ہو) بلکہ سوتے جاگتے کی کیفیت میں آتے ہیں۔ اور خواب میں انسان وہی کچھ دیکھتا ہے (الّا ماشاء اللہ) جو اس کے تحت الشعور میں موجود ہے، اُس پر بیتا ہے، اُس کے جذبات و احساسات ہیں۔ (وحیِ خفی کا معاملہ جداگانہ ہے)

ہم انبیاؑ کے علاوہ بھی انسانوں پر الہامِ ربّانی کے امکان سے منکر نہیں مگر یہ صلاحیت کسبی نہیں بہرحال وَہبی ہے۔ کسی کا یہ دعویٰ درست نہیں کہ جب چاہوں ملاءِ اعلیٰ میں جھانک لوں۔ نبی ﷺ بھی اپنی خواہش کے جواب میں وحیِ ربّانی کا بے چینی سے انتظار فرماتے تھے۔۔۔ رویاءِ صادقہ کے لیے اور الہامِ ربّانی کے لیے مومن و کافر کی کوئی تمیز اللہ تبارک وتعالیٰ نے روا نہیں رکھی اور ہمیں بھی نہیں چاہیے کہ اشارۂ غیبی کو اپنے مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہونے کا ثبوت قرار دینے لگ جائیں۔

یہ چند اُمور گنوا دینے کا مطلب یہ ہے کہ صلاحیتِ کشف کے دعویٰ سے گریز اچھا ہے اور کشف کو اشارۂ غیبی مِن جانب اللہ سمجھ لینے سے پہلے اُس کے تمام ہی پہلوؤں کو قرآن اور اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں پرکھ لیا جائے کہ یہ الہام شیطانی تو نہیں۔۔۔ ہم جانتے ہیں کہ افلاطونی فلسفے، نوفلاطونیت، مَزدکیّت اور ویدانت کے اثرات قبول کرنے والے، ان عجمی افکار کو دین کی بنیاد ثابت کرنے کے لیے باطنیّت (آیاتِ قرآنی کے اختراعی باطنی معانی) کے علاوہ زیادہ تر ''کشف'' ہی کا حوالہ دیتے ہیں۔ مگر اشرف علی تھانوی جیسے وحدۃُ الوجودی بزرگ، ابنِ عربی کی ہفوات کا دفاع کرتے نہیں تھکتے مگر یہ کہہ دیتے ہیں کہ: ''کشف کی حیثیت حیضُ الرّجال سے بڑھ کر نہیں''۔ (مزعومہ کشف کی اس سے زیادہ توہین ممکن نہیں اور وہ بھی ایک وحدۃُ الوجودی صوفی کی زبان سے)۔

بہرحال کسی بزرگ کو کشف سے یہ معلوم ہو گیا ہو کہ نفس، بدن سے باہر ایک لطیف وجود ہے جسے فنا نہیں اور کسی کو یہ الہام ہوا ہو کہ نہیں ایسا باکمال لطیف وجود تو روح ہے۔ یا کسی کو ہاتفِ غیبی نے یہ صدا دی ہو کہ برزخ ایک پردہ، آڑ، روک اور وقفہ نہیں بلکہ عالَم ہے، جہان ہے، مکان ہے اور کسی کو یہ خبر ملی ہو کہ عِلّیّین اور سجّین، کتاب نہیں ارواح کے رہنے کے مقامات ہیں۔۔۔ ہم بصد ادب یہی گزارش کریں گے کہ قرآن کو سامنے رکھیں، عربیِ مبین کے ساتھ کوئی کھیل تماشا لگائے بغیر، باطنیّت کا کوئی سوانگ بھرے بغیر، غور فرمائیں، آپ حقیقتِ حق جان لیں گے۔

Marfat.com

رِبا اور اسلامی معیشت

اللہ تبارک وتعالیٰ نے رِبا کو حرام قرار دیا ہے۔ مگر دنیا بھر میں تمام معاشی معاملات مروّجہ سود پر چل رہے ہیں اور مسلمانوں کے لیے بہ ظاہر یہ بات ناممکن دکھائی دیتی ہے کہ وہ دنیا بھر سے الگ تھلگ یعنی (In Isolation) رِبا کی (بلکہ درحقیقت سود کی) متبادل اساس پر اپنی معیشت استوار کرسکیں۔ بایں ہمہ ہمیں یقینِ کامل ہے کہ دینِ اسلام دینے والے اللہ اور اسے ایک بار مکمل طور پر نافذ کر دکھانے والے نبیٔ کریم ﷺ نے ہم سے ایسے دین اور ایسے احکام پر چلنے کا مطالبہ نہیں کیا جو ناممکنُ العمل ہوں۔ چنانچہ اہلِ علم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ رِبا کی درست تشریح تک پہنچ کر، قرآن وحدیث کی روشنی میں مسلمانوں کی معاشی مشکلات کا ایسا حل (معیشت کی متبادل اساس) تلاش کریں جو فی الفور نافذ العمل ہو سکے۔

قرآنِ حکیم میں رِبا کے براہ راست احکام تین سورتوں میں آئے ہیں (سورہ النّساء 161 میں یہودیوں کے حوالے بھی سے رِبا کا ذکر ہوا ہے)

☆ سب سے پہلے سورۂ الروم میں جو مکّی سورت ہے (ہجرتِ حبشہ کے زمانے میں) اور پانچ سن نبوی میں نازل ہوئی۔ ارشاد ہوا: وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ج وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (39:30)

☆ دوسرا حکم سورۂ آلِ عمران میں نازل ہوا اور اس کا نزول (تیرھویں رکوع سے ختم سورہ تک جس حصے میں آیت آئی ہے۔ جنگ اُحد کے بعد) سن تین ہجری میں ہوا، فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (130:3)

Marfat.com

☆ تیسرا تفصیلی حکم سورۃ البقرہ میں آیا اور یہ رمضان سن 9 ہجری کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ○ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (280-275:2)

چنانچہ یہ امر یقینی ہے کہ مسلمانوں یعنی صحابہ کے پاس ربا کا معنی ومفہوم اور اس کی حدود و قیود جاننے کے لیے، پہلی آیت کے لحاظ سے اٹھارہ سال، دوسری آیت کے حساب سے آٹھ سال اور تیسرے حکم کی رعایت سے تقریباً 15 ماہ کا وقفہ موجود تھا۔ پھر یہ کہ حجۃ الوداع میں نبی اکرم ﷺ کے خطبے میں ربا کا ذکر ہوا۔ اور اس حج کے بعد بھی آپ ﷺ 3 ماہ تک صحابہؓ کے درمیان موجود رہے۔

نبی اکرم ﷺ نے ابلاغ کی ذمہ داری کماحقہٗ پوری کی اور صحابہ کے بارے میں بارہا مذکور ہے کہ ہر چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی وہ آپ ﷺ سے احکام کی وضاحت طلب کرتے رہے اور آیاتِ قرآنی کی تفہیم وتبیین سے غافل نہیں رہے۔ چنانچہ اندریں حالات جب ہم ایک روایت میں حضرت عمرؓ کی زبان سے یہ الفاظ سنتے اور پڑھتے ہیں تو حیرت کے سمندر میں کھو جاتے ہیں۔ ”آیتِ ربا قرآن کی ان آیات میں سے ہے جو آخر زمانہ میں نازل ہوئیں اور نبی ﷺ کا وصال ہو گیا، قبل اس کے کہ آپ اس کے تمام احکام ہم پر واضح فرماتے لہٰذا تم اس چیز کو بھی

Marfat.com

چھوڑ دو جو ربا ہے اور اس کو بھی جو مشکوک (ریبہ) ہے"۔ (مسند احمد)۔۔۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب اس کتاب کو موضوع قرار دیا گیا ہے اور اس طرح کی روایت کا ادخال کرنے والے وہ لوگ ہیں جو دراصل حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر طعن کرنا چاہتے ہیں کہ یہی ہے اُمتِ مسلمہ کا سب سے بڑا فقیہہ جسے عمر کا بڑا حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گزار کر بھی علم نہ ہوسکا کہ رِبا کیا ہے!!

صحیح بخاری، کتاب البیوع 297 میں اور دیگر کئی کتبِ حدیث میں مذکور ہے:

"جب سورۃ البقرہ کی ربا کے بارے میں آیات نازل ہوئیں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرے سے باہر تشریف لائے اور آپ نے (رِبا کے بارے میں کچھ کہنے کی بجائے) حکم فرمایا کہ آج کے بعد سے شراب کی تجارت حرام ہے"

حالانکہ شراب کی حرمت ان آیات کے نزول سے بہت پہلے سے نافذ العمل تھی اور ایسی روایات سے بھی رِبا کے اصل معنی ومفہوم پر شکوک وشبہات کے پردے ہی پڑتے ہیں۔ صحیح بخاری میں آیاتِ رِبا کو ایک جگہ درج کرنے کے بعد جتنی روایات امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے درج کی ہیں، ان میں ربا کا فی نفسہٖ کوئی ذکر نہیں بلکہ محض تجارت میں دھوکہ دہی سے منع کیا گیا ہے۔ یہی معاملہ مشکوٰۃ المصابیح بابُ الرِّبا کا ہے جس میں معاملات کو شفاف رکھنے اور دھوکا دہی سے بچنے کا ذکر ہے۔

❁❁❁❁

اس مختصر بیان سے ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ پہلے تو یہ باور کرایا گیا کہ رِبا کی کوئی یقینی تعبیر ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ملی اور پھر آیاتِ قرآن اور بعض براہِ راست متعلق احادیث کی من مانی ترجمانی کی جانے لگی۔ علما فرماتے ہیں کہ: "قرض کے مقابلے میں اصل سے زائد جو کچھ بطور شرط وصول کیا جائے وہ ربا ہے۔" (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، سود، صفحہ 268)...... حالانکہ مولانا اصلاحی لکھتے ہیں: "رِبا وہ مال ہے (یا قرض ہے) جو سود حاصل کرنے کے لیے دیا جائے"۔ (تفہیم دین، صفحہ 34) اور درحقیقت یہی معنی احادیث سے بھی مرتب ہوتے ہیں:

كُلُّ قَرضٍ جرّ بہٖ نفعاً فھو ربا (ہر وہ قرض، جس قرض سے نفع حاصل ہو، وہ قرض ربا ہے) اور

كلّ قرضٍ جرّ منفعةً فھو شرط من اشراطِ الرّبا (ہر وہ قرض جو نفع لے کر آئے، وہ قرض یا مال رِبا کی صورت میں سے ایک صورت ہے)

رِبا کے یہی معنی نصِ قرآن سے بھی واضح ہیں (جب تک کوئی شخص من مانی کی کوشش نہ

کرے): وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ (39:30) ''اور جو ربا تم دیتے ہو کہ وہ (مال یا قرض) لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر بڑھ جائے (یعنی تم اس ربا، اس مال، اس قرض پر لوگوں کے اموال سے نفع حاصل کرتے ہو)''...... یہ الفاظِ قرآنی اس قدر واضح ہیں کہ ربا کو محض سود قرار دینے والے بھی پریشان ہو گئے اور اُنھوں نے اس آیۂ قرآن کا معنی قارئین پر اس طرح تھوپنا چاہا کہ ان الفاظ میں نوتہ یعنی جوابی تحفے کا ذکر ہے۔ (یعنی مال کے بدلے میں مال)۔ اگر ہم خطبہ حجۃ الوداع کے الفاظ دیکھیں تو وہاں بھی ارشادِ گرامی یہی ہے: فانّہ موضوع کلّہٗ اور ہمیں کہیں نہیں ملتا کہ حضرتِ عباس ﷜ کی اولاد لوگوں سے ''راس المال'' اکٹھا کرتی رہی ہو۔

دینِ اسلام کا نقطۂ نظر بالکل واضح ہے: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (275:2) ''اللہ تعالیٰ نے بیع کو (اموال کو گردش میں لائے رکھنے کو اور جائز منافع کمانے کو) حلال قرار دیا ہے اور ربا کو (اموال فاضلہ کو اپنے پاس روکے رکھنے کو) حرام قرار دیا ہے۔'' یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ (276:2) اللہ تعالیٰ اموالِ فاضلہ کو روک کر رکھنے کو، ربا کو ختم کر دیتا ہے اور صدقات کو، اموال کو فی سبیلِ اللہ اور فلاحِ انسانیت کے لیے خرچ کرنے کی بنا پر بڑھا دیتا ہے۔۔۔ اور فرمایا: لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (130:3) اپنا زائد از ضرورت مال بینکوں اور تجوریوں میں رکھ کر اور سودی قرضوں پر دے دے کر دوگنا، چوگنا کر کر کے مت کھاؤ۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: وَیَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ (219:2) ''اور اے نبی ﷺ یہ لوگ آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا (اللہ کی راہ میں، محتاجوں کی مدد میں) خرچ کریں۔ آپ ﷺ انھیں کہہ دیں کہ العفو...... جو بھی زائد از ضرورت ہو۔'' ہم جانتے ہیں کہ زائد از ضرورت اموال کو خرچ کرنے کے پانچ ذرائع ہیں جن میں سے دو پسندیدہ ہیں اور تین ناپسندیدہ۔

1 پہلا طریقہ یہ ہے کہ ایسے اموال (نقدی وزر، زمین اور جائداد، سامانِ ضرورت) کو فی سبیل اللہ معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کر دیا جائے۔

2 دوسری پسندیدہ صورت یہ ہے کہ اس مال و دولت سے کاروبار کریں، صنعتیں لگائیں، زمینیں آباد کریں اس مال کو پوری طرح گردش میں لائیں اور ہزاروں انسانوں کی ضرورتیں پوری کرنے کا ذریعہ بنیں۔

Marfat.com

3 تیسری مگر ناپسندیدہ صورت یہ ہے کہ زمین اور مکان خرید کر انھیں کرایے پر چڑھا کر العفو سے اضعافاً مضاعفہ پیدا کرنے کا حیلہ اختیار کرلیا جائے۔ جبکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسی حیلہ سازی کو نبیِ اکرمe نے ناپسندیدہ فرمایا اور ارشاد ہوا کہ یہ شئے تمھاری کب ہے!!!

4 چوتھی صورت ان اموالِ فاضلہ کو کہیں بھی استعمال نہ کرنے اور انھیں تجوریوں، بینکوں اور بانڈز کی صورت میں منجمد کر دینے کی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کنز قرار دیا ہے اور فرما دیا ہے کہ ایسے افراد کو عذاب الیم کی خبر دے دو۔ (34:9)

5 پانچویں اور سب سے زیادہ ناپسندیدہ صورت یہ نکال لی گئی ہے کہ ان اموالِ فاضلہ کو کرایے پر چڑھا دو یعنی اپنا فالتو مال مستحقین کو قرض دے کر اس پر ان سے سود وصول کرو۔

اس سودخوری کے معاملے کو قرآن پاک نے دو طرح سے ہمارے ذہن نشین کرایا ہے۔ فرمایا کہ جو اموالِ فاضلہ کو (ربا کو) اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بجائے اس پر سود وصول کریں (مزید ربا کمائیں) اور اللہ کے اس کی حرمت کے حکم کو خاطر میں نہ لائیں (یعنی صاف اور صریح بغاوت کا رویہ دکھائیں) تو ایسا کرنے والے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار رہیں...... یقیناً یہ بہت بڑی وعید ہے مگر لڑائی کے لیے آمادگی اور اللہ کی طرف سے جوابی کارروائی کا عندیہ اپنی جگہ...... انھی آیات میں اس سے پہلے فرما دیا ہے: وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ (275:2) اور جو باز نہ آئے، پھر رِبا سے مزید رِبا کمانے پر آمادہ رہے، تو ایسے لوگ جہنمی ہیں...... گویا اللہ سے جنگ کا نتیجہ بھی سنا دیا گیا ہے۔

بات بالکل صاف ہے۔ جہنمی ہونے کے صریح فیصلے کو معمولی قرار دینے والے اور جنگ کی وعید کو (للکار کو) کھول کھول کر بیان کرنے والے جانتے ہیں کہ اموال کو کنز کرنا (تجوریوں اور بینکوں میں رکھے ہوں یا زمینوں، جائیدادوں، فلیٹوں اور پلازوں کی شکل میں) ان تمام اموالِ فاضلہ کے اس طرح منجمد کر دینے پر بھی اللہ تعالیٰ نے عذابِ الیم کا فیصلہ سنا دیا ہے اور جہاں کنز سے منع فرمایا ہے، ارشاد ہوا ہے: وَلَا يُنفِقُونَهَا (اس سب کو خرچ نہیں

Marfat.com

کرتے)...... اللہ تعالیٰ نے لَا یُنْفِقُوْنَ مِنْهَا (اس میں سے خرچ کرنے) کا ذکر نہیں کیا جیسا کہ دیگر متعدّد مقامات پر ارشادِ ربّانی موجود ہے...... مگر علماءِ حدیث نے نام نہاد خلفاء و سلاطین کے ذاتی خزانوں کو تحفّظ دینے کے لیے ایک روایت گھڑ لی: ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ھذا قبل ان تنزل الزکوٰۃ (یہ آیۂ کنز، یعنی اموال کو کنز کر لینا اور انھیں اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے پر عذابِ الیم کی وعید، زکوٰۃ کی فرضیت سے پہلے کی بات ہے......اب زکوٰۃ یعنی ان اموال کا اڑھائی فیصد ہم علما کو دے دو تو یہ سارا کنز کردہ مال تم پر حلال ہو جائے گا)...... یہ ظالم یہ نہیں دیکھتے کہ سورۂ التوبہ (آیت 34) سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ایک سورہ ہے جبکہ زکوٰۃ کی فرضیت کے احکام بہت پہلے نازل ہو چکے تھے بلکہ مکّی سورتوں میں بھی کثرت سے زکوٰۃ کا ذکر ہوا ہے۔

اگر ہمارے علما رِبا کے لیے فی النّار کی وعید کا ذکر کریں تو انھیں اپنے مربّی و محسن مترفین کے لیے بھی جو کنز کے عادی ہو چکے ہیں، عذابِ الیم کی وعید بار بار دہرانا پڑتی ہے۔ مگر یہ کس قدر مشکل کام ہے!! اتنا ہی جتنا کہ زکوٰۃ کا شور و شغب، اپنے مدرسوں کے لیے زکوٰۃ وصول کرتے رہنا مگر عشر دینے کی سکت رکھنے والوں کو کھلی چھٹی دیے رکھنا۔ ان جاگیرداروں کے سامنے بھیگی بلّی بنے رہنا۔

ہر دور کے اپنے مسائل رہے ہیں جیسے کہ نام نہاد خلفاء و سلاطین کے ادوار۔ انھیں کنز کی چاہ تھی (اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ) مفتیوں کے لیے راستہ نکال لینا کتنا آسان ثابت ہو۔ سرکاری بیت المال ذاتی خزانے بن گئے۔ انھیں خواہش تھی طرح طرح کی عورتوں کی، مفتیوں نے غلامی کے راستے کو جسے اللہ اور اس کا رسول مسدود کر چکے تھے (فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً، سورہ محمد) پھر سے ان مترفین کے لیے ہموار کر دیا...... انھیں شوق تھا بازارِ ظلم گرم کیے رکھنے کا۔ علما نے تقدیر کا غیر قرآنی فلسفیانہ نظریہ اپنا کر اسے قرآن میں مذکور پانچ ایمانیات پر مستزاد (چھٹا ایمان: والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ) بنا کر مظلوم و محکوم عوام کے ذہنوں میں راسخ کر دیا...... یہی تمھاری قسمت میں لکھا ہے!!!

❁❁❁❁

آج کے دور کے مسائل پر کسی مفسر، محدّث، فقیہہ کی نظر نہیں۔ آج سارا معاشی نظام بینکوں

Marfat.com

کے سہارے چل رہا ہے:

1 اولاً اموالِ فاضلہ کم ہوں یا زیادہ، چوروں ڈاکوؤں کی دست برد سے بچا کر بینک میں رکھنا ضروری ہے۔

2 ثانیاً رقوم کی منتقلی کا محفوظ ذریعہ بینک ہی ہیں۔

3 ثالثاً امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس صرف اسی ذریعے سے ممکن ہے۔

4 رابعاً دنیا بھر کی مختلف کرنسیوں کا لین دین بینک کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔

5 خامساً تنخواہوں کی ترسیل کا موثر ذریعہ ہے۔

6 سادساً ہر طرح کے ٹیکس کی وصولی بینک کے ذریعے ہوتی ہے۔

7 سابعاً ہر قسم کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے بڑی بڑی رقوم درکار ہوتی ہیں جن کا اہتمام بینکوں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

چنانچہ بینکوں کے نظام کو فی نفسہٖ باطل قرار دینا ایسے ہی ہے جیسے ایک سو سال پہلے ہمارے علما نے لاؤڈ سپیکر کو شیطانی چرخہ قرار دے کر اس کا بائیکاٹ کیا تھا۔

ضرورت تو صرف اس امر کی ہے کہ معیشت کی ترقی اور استحکام کے اس ذریعے کو، رِبا کی ہر شکل اختیار کر لینے سے روک دیا جائے۔ اس اصل مقصد کے حصول کے بجائے مفتیانِ کرام نے جو راستے تجویز کیے ہیں وہ سب کے سب بینک کی بنیادی ہیئت اور اس کے نظام کو ہی تبدیل کر دینے کا تقاضا کرتے ہیں۔ مضاربہ اور مشارکہ کی تمام شکلیں اس امر کی متقاضی ہیں کہ بینک کرنسی کے لین دین کی بجائے، ایک تجارتی یا صنعتی ادارہ بن جائے۔ جن بینکوں نے یہ نقاب اوڑھ لیا ہے، وہ محض آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔

بعینہٖ سود کی ایک متبادل اساس، قرض کے بدلے میں قرض تجویز کی گئی ہے یعنی ایک ہزار روپیہ ایک سال کے لیے لینے والا، پانچ سال کے لیے دو سو روپیہ بینک کو قرض دے گا (گویا رقم ضرب مدت کی Equation حل ہوگئی)۔ اوّل تو یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ شخصِ مذکور آٹھ صد روپیہ لے کر ایک سال کے بعد بینک کو ایک ہزار روپیہ دے گا تو اُس نے کیا کمایا۔ پچیس فی صد مفروضہ منافع کما کر اس نے بینک کو دے دیا، خود مزید کتنا کماتا ہوگا......!! دوم بینک دو سو روپیہ خواہ کتنے عرصے کے لیے ہی کیوں نہ رکھے، یہ دو سو روپیہ کون سے ایسے انڈے

Marfat.com

دے گا جو خالصتاً عدل کے اُصولوں پر وصول کیے گئے ہوں......!

اس دور کا بڑا مسئلہ افراطِ زر ہے اور اس کی بنا پر زر کی قدر کا مسلسل گرتے چلے جانا......اس کا ایک جواب تو ہر عالم و فاضل کی زبان پر ہے کہ سود کی شرح کی زیادتی ہی افراطِ زر کا سبب بنتی ہے۔ مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج بچا کر رکھا گیا ایک ہزار، ایک سال کے بعد نو سو یا آٹھ سو ہی رہ جاتا ہے۔ اگر چہ یہ صورتِ حال عالمی پیمانے پر ایک صدی پہلے سے موثر ہوئی ہے مگر کیا ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ دینِ اسلام جسے تا ابد عالم انسانیت کا دین بننے کا شرف بخشا گیا ہے، اس دین کے مبادی و اُصول میں اس اُلجھن کا کوئی حل موجود نہیں......!!

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ علما کا تشخیص کردہ رباءُ النّسیہ تو بالیقین یہی سود ہے جو نقد کی صورت میں رِبا پر مزید رِبا کمانے کا مذموم ذریعہ ہے مگر جسے علما نے رباء الفضل قرار دیا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور علما و فقہا نے ایسی تمام احادیث کا مقصد و مدعا سمجھا ہی نہیں۔

1 چند احادیث میں صرف اس بات پر زور دیا گیا ہے دھوکا دہی اور تول میں کمی بیشی نہ ہو۔ سونے کے جڑاؤ زیور کو سونے کے عوض نہ بیچا جائے جب تک نگ اور سونے کو الگ نہ کر لیا جائے۔

2 سونے، چاندی، گیہوں، جو اور نمک کا مبادلہ جیسے کا تیسا، برابر برابر اور دست بدست ہو۔ یعنی ان کی قیمتوں کے تعیّن میں ہیرا پھیری نہ ہو۔

3 دینار کو دینار کے بدلے اور درہم کو درہم کے بدلے بیچو۔ یعنی زر کی قدر کا بالکل درست تعیّن ہونا ضروری ہے۔

4 ولا ربا الاّ فی النسیئة...... اور زیادتی کی اجازت نہیں ہے مگر صرف ادھار کی صورت میں......یعنی زر کی قدر کے تعیّن کی نصیحت کرنے کے ساتھ یہ بھی اجازت دے دی کہ اگر ادھار کی صورت میں، وقت گزرنے کے ساتھ زر کی قدر میں کمی بیشی ہو جاتی ہے تو اس صورت میں (زر کی قدر کے لحاظ سے) زیادتی کی اجازت ہے......ادھار کی صورت میں ہی اس کا امکان ہے۔

5 دینار کے بدلے دینار، کم نہ زیادہ، وصول کرنے کا حکم ایسا نہیں ہے کہ اس سے صرفِ نظر کیا جا سکے۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ میں تمھیں ابھی ابھی ایک ہزار دینار دیتا ہوں، تم دوسرے ہاتھ سے مجھے ایک ہزار دینار دے دو۔ یہ تو ایک لایعنی بات ہوئی۔ اس حکم کا معنی یہی

Marfat.com

نکلتا ہے کہ زر کے مبادلے کے وقت، زر کی قدر کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو۔

6 بیع سلم کے لیے (نقد روپیہ دے کر سال، دو سال بعد اجناس دینے کا وعدہ) اس بات کا متقاضی ہے کہ ادھار والے مال کا معیّن ماپ، معیّن تول اور معیّن معیاد طے کر لی جائے (فی کیلِ معلوم، وزنِ معلوم، الی اجلِ معلوم)......آج اس رقم کے بدلے جو مقدار آسکتی ہے، اُدھار کی صورت میں اس پر اضافے کی اجازت ہے۔

❁❁❁❁

اب رہا یہ سوال کہ زر کی قدر کا تعیّن کس طرح ممکن ہے! کچھ عرصہ قبل تک سونے کو قدرِ زر کا معیار بنایا جاسکتا تھا مگر پانچ یا دس فی صد مالیت کے سونے کی مقدار کے مقابلے میں سو فی صد روپے کے نوٹ چھاپ دینے کا رواج پڑ چکا ہے۔ اس لیے سونا ایک انتہائی گراں قدر جنس ہے جس کا پیپر کرنسی سے کوئی موازنہ نہیں ہوسکتا۔ یہی صورتِ حال آئل مارکیٹ کی ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی مملکتیں، تیل کے ذخائر پر قبضے کی متمنّی ہیں۔ تیل کی قیمتیں بڑھا دیتی ہیں، گرا دیتی ہیں، تیل کے ذخائر کھول دیتی ہیں، بند کر دیتی ہیں۔ حتیٰ کہ جی چاہے تو انھیں آگ بھی لگا دیتی ہیں۔

بایں ہمہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ:

1 روپے کی قدر (اور کسی نہ کسی طور سے ڈالر اور یورو کی بھی) کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔

2 آج دی گئی رقم کی قدر کا موازنہ سال بعد کی قدر سے نہیں کیا جاسکتا......

3 بینک کا ایک مکمل نظام ہے اور وہ اپنی خدمات کے عوض معاوضے کا مستحق ہے......

4 بینک کو عوام سے رقوم لے کر کچھ عرصہ گزرنے پر زر کی قدر کے لحاظ سے اس رقم کو لوٹانے کا پابند ہونا چاہیے......

5 بینک مختلف مصارف کے لیے جو رقوم صارفین کو دیتا ہے، اگر ان پر اضافہ وصول نہ کرے تو اس کا (بلکہ ہزارہا کھاتہ داروں کا) سرمایہ وقت کے ساتھ ساتھ مائل بہ زوال رہے گا......ایسے ہی بے شمار مسائل ہمارے سامنے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ رِبا کے اصل معانی (اموالِ فاضلہ) کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ ان

Marfat.com

اموال کو کنز بننے اور کرایہ داری کا ذریعہ بننے سے بچایا جائے تا کہ...... دولت صرف اغنیاء کے ہاتھوں میں نہ رہے...... اور ٹیکس یعنی زکوٰۃ وعشر کے قوانین کو علما کی دست برد سے بچا کر اس طرح نافذ کیا جائے کہ دینِ اسلام کے ایک بڑے مقصد یعنی عدلِ اجتماعی کے تقاضے پورے کیے جا سکیں۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مکانوں اور پلازوں کی کرایہ داری کو جائز سمجھ لیا گیا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو بھی مکانوں اور پلازوں، اسی طرح پلاٹوں اور زرعی زمینوں پر (جہاں سے عشر نہیں ملتا، بیکار پڑی ہیں) خاص شرح سے ٹیکس لگنا چاہیے۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ باون تولہ چاندی پر زکوٰۃ ہے مگر اسی چاندی کی طرح زیر استعمال دو کروڑ کے گھر اور دو ارب کی فیکٹری سے شرعاً کچھ وصول نہیں کیا جا سکتا...... کیوں نہیں!! گاڑی، گھر، فیکٹری پر زکوٰۃ (ٹیکس کی کوئی خاص شرح) لاگو ہونی چاہیے۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مبلّغین اور دینی ادارے زکوٰۃ سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔ زکوٰۃ وعشر پر اصل حق یتیم، مسکین، اعزّہ، پڑوسی، نادار، بیمار، معذور، مقروض، بیوہ اور لاوارث کا ہے...... نبیِ اکرم ﷺ اور ان کے اہل خانہ کی طرح زکوٰۃ ''مبلّغینِ اسلام'' پر بھی حرام ہے اور تعلیمی اداروں کے لیے سرمایہ داروں کو چاہیے کہ زکوٰۃ سے بڑھ کر نفلی صدقات مہیا کریں۔ نیم سیاسی ادارے کسی بھی طرح زکوٰۃ کے اہل نہیں۔

علما وفقہا کا سارا زور معاشرے میں عدلِ اجتماعی قائم کرنے پر ہونا چاہیے اور اس کے لیے رِبا کو کنز ہونے سے بچانا ہے۔ رہی بات بینکوں کے لین دین کی تو اس کے لیے زر کی قدر متعین کرنے کا ایک ادارہ قائم ہونا چاہیے جو کمی بیشی متعین کر کے ماہ بہ ماہ اس کا اعلان کرتا رہے اور لین دین اسی شرح سے (اضافے یا کمی کی بنیاد پر) ہوتا رہے۔

ایک بڑا مسئلہ تجارتی افراد یا صنعتی گروپس کے لیے بڑی رقوم مہیا کرنے کا ہے کیوں کہ اس کے بغیر بڑے پراجیکٹ نہیں لگائے جا سکتے۔ ماضی میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ کم شرح سود پر رقوم لے کر، زیادہ شرح سود دینے والے اداروں میں جمع کرا دی گئیں اور بینکوں کے صارفین قرض پر سود ادا کرنے کے ساتھ ساتھ 2-4 فی صد منافع گھر بیٹھے کماتے رہے ہیں۔ چنانچہ بغیر منافع بڑی رقوم صارفین کو دے دینے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ بینک اپنی رقوم لٹا کر خالی ہاتھ ہو جائیں۔ چنانچہ ہمیں بین الاقوامی احوال کو پیشِ نظر رکھ کر اور اس نظام کی پیچیدگیوں

Marfat.com

کو سمجھ کر ہی کسی مناسب فیصلے تک پہنچنا ہوگا۔

یہ کہنا غلط نہیں کہ عہدِ نبوی ﷺ میں بھی اور اس کے بعد بھی عرصہ دراز تک زیادہ تر حاجت مندوں سے ہی سود وصول کیا جاتا تھا اور یہ Exploitation کی بدترین صورت ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک شخص یا ادارے کو بڑی بڑی رقوم تجارتی یا صنعتی مقاصد کے لیے متعین شرح منافع کے ساتھ دینے میں ایسا کوئی قبیح امر مانع نہیں ہے۔

رہی بات مشارکہ اور مضاربہ کی تو ہمارے روزمرہ کے احوال ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ بڑے نیک نام ادارے اور حاجی نمازی کاروباری لوگ بھی لوگوں کی رقوم مشارکت اور مضاربت کے نام پر لے کر کبھی ایسی تجارت یا صنعت کا منافع ظاہر نہیں کرتے جس میں لوگوں کی رقوم لگی ہوئی ہوں۔ چنانچہ ایمانیات، اخلاقیات اور اعلیٰ اقدار کے معاشرے سے مفقود ہو جانے کی اس المناک صورتِ احوال میں ایسے معاملات کا خیر وخوبی سے چلنا ممکن نہیں رہا۔ چنانچہ جس طرح نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہاتھوں ہاتھ اور برابر برابر سودا کرو مگر...... ولا ربآ الاَّ في النسيئة...... بڑھوتری یا اضافہ یا زیادتی تو صرف ادھار کی صورت میں ہی ہے۔ یہ اضافہ متعین ہونا چاہیے۔ مقدار اور وزن اور مدت، ہر لحاظ سے...... جیسا کہ بیع سلم کے ضمن میں نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا...... اور یہ دونوں احادیث پوری اُمتِ مسلمہ کی رائے میں صحیح احادیث ہیں۔

❁❁❁❁

Marfat.com

چند اہم

قرآنی اِصطلاحات

صلاح الدین ایوبی

Marfat.com